

سے وہاں پھیلی نیلا ہٹ ہرگز رتے لمحے کے ساتھ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

”بڈا تار دیں۔“ کمشنر نے بیٹھے ساتھ اس کے سر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سیدھی ہو کے بیٹھی، آنکھوں کی پتلیاں سکیڑے غصے سے اسے دیکھے گئی۔ پھر بڈ پیچھے گرا دی۔

”آپ کو یہ زخم کیسے پیش آئے؟“ وہ اس کے سامنے بیٹھا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

”لائٹ آہستہ کر دیں۔“ اس نے ماتھے کے اوپر ہاتھ کا چھجا بنا لیا۔ چہرے پہ خوف سا پھیلنے لگا تھا۔

”آپ کو اندھیروں میں رہنے کی عادت ہو گئی ہے شاید۔ اسی لیے آپ یہاں کسی کو فیس نہیں کر پار ہیں۔“

”مجھے... مجھے اپنے آفس میں لے جائیں۔ میں یہاں نہیں بیٹھ سکتی۔“ اس نے سر جھکا دیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ وہ روشنی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”کیا آپ کو روشنی کا فوبیا ہے؟“

اس نے چہرہ اٹھا کے برہمی سے کمشنر کو دیکھا۔ ”مجھے ایک دفعہ پہلے بھی اسی طرح گرفتار کیا گیا تھا۔ مگر وہ سب ایک پریکٹس تھا۔ مجھے اس... اس تفتیشی کمرے کا فوبیا ہے۔“

”ہوں۔ یہاں آنے سے وہ ساری یادیں واپس آرہی ہیں؟“

تالیہ نے کرب سے آنکھیں میچ لیں اور سر جھکا دیا۔ دونوں ہاتھ کنپٹیوں پر رکھ لیے۔

”آپ اتنا عرصہ کہاں تھیں؟“

”میں اپنے وکیل کی غیر موجودگی میں کچھ نہیں بولوں گی۔“ سختی سے آنکھیں میچے وہ بولی۔

”ابھی آپ نے اپنے وکیل کو جو کال کی تھی وہ اسپیکر فون پہ میں نے سنی تھی۔ وہ آپ سے کہہ رہے تھے کہ ہم پولیس والے

آپ کو بولنے پہ اکسائیں گے اور آپ نے صرف خاموش رہنا ہے۔ لیکن چے تالیہ...“ وہ آگے کو ہوا اور نرمی سے بولا۔ ”ہم

آپ کے دشمن نہیں ہیں۔ آپ جب تک اپنی کہانی ہمیں نہیں سنائیں گی ہم کیسے آپ کی مدد کریں گے۔“

وہ کنپٹیوں پہ ہاتھ رکھے آنکھیں میچے بیٹھی رہی۔

”آپ نے عصرہ کا قتل کیوں کیا؟“

”میں نے عصرہ کا قتل نہیں کیا۔“ اس نے آنکھیں کھولیں اور کمشنر کو دیکھ کے غرائی۔

”یعنی آپ بے قصور تھیں؟“ آفیسر کا لہجہ مزید نرم ہوا۔ تالیہ کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ پلکیں جھپکائیں۔ کمشنر کو محسوس ہوا وہ

آنکھوں کو تیز روشنی کا عادی کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

”آپ میرے ساتھ گڈ کاپ کھیل رہے ہیں؟ میں کچھ نہیں بولوں گی۔“

”نہیں۔ مجھے واقعی اس کیس کے مندرجات پہ شک ہے۔ آپ میرے ساتھ تعاون کریں تو ہم کوئی حل نکال لیں گے۔ لیکن اگر آپ بے قصور تھیں تو چھ سال تک مفروز کیوں رہیں؟“

”میں مفروز نہیں تھی۔“ وہ تیزی سے بولی۔ پھر دروازے کو دیکھا۔ ”میرے وکیل ابھی تک کیوں نہیں آئے؟“

”تو پھر آپ کہاں تھیں؟“ وہ اس کی آنکھوں سے نگاہیں ہٹائے بغیر بولا۔

”میں....“ اس نے لب کاٹے۔ ”میں اپنی مرضی سے غائب نہیں ہوئی تھی۔“

”یعنی کسی نے آپ کو غائب کیا تھا؟“

آئینے کے پار تین افسران کھڑے غور سے اس کمرے میں جھانک رہے تھے۔ تالیہ ان کو نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن وہ اسے دیکھ سکتے تھے۔ ان کے پاس نصب اسکرینز پہ اس کے چہرے کا کلوز اپ دکھایا جا رہا تھا۔ اس کا ہر لفظ ریکارڈ کیا جا رہا تھا۔

”مجھے.... مجھے اغوا کیا گیا تھا۔“ اس نے کہنے کے ساتھ خشک لبوں پہ زبان پھیری۔ دیوار پہ لگی تیز روشنی اس کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔

”کس نے اغوا کیا تھا آپ کو؟“

”مجھے نہیں پتہ۔ میں نے اغوا کاروں کا چہرہ نہیں دیکھا۔“ اس نے پھر سے دروازے کو دیکھا۔ مٹھیاں میز پہ رکھے وہ روشنی کے باعث چہرے کو تر چھاکے بیٹھی تھی۔ آفیسر کی آنکھوں میں نہیں دیکھ رہی تھی۔

”تالیہ.... آپ کو اپنا دعویٰ ثابت کرنا پڑے گا۔“ کاشنر کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ تالیہ نے چونک کے اسے دیکھا۔

”چھ سال تک آپ کو کس نے اغوا کر کے رکھا ہاں؟“ وہ اب سختی سے پوچھ رہا تھا۔

”مجھے.... نہیں پتہ۔“

”انہوں نے آپ کو اغوا کر کے جس جگہ رکھا تھا اس کے بارے میں بتائیں۔“

وہ لمحے بھر کو چپ ہوئی۔ ”پتہ نہیں۔ میری آنکھوں پہ پٹی تھی۔“ توقف سے سوچ سوچ کے بولنے لگی۔ ”جب پٹی کھلتی تو

ایک... مستطیل سا کمرہ نظر آتا۔“

”اس کمرے میں کوئی دروازہ تھا؟“

”نہیں۔ ہاں۔ ہاں تھا۔“ وہ تیزی سے بولی۔ تیز روشنی کے سامنے ماتھے پہ ہاتھ کا چھجا پھر سے بنالیا۔ ”اصل میں وہ کمرہ

نہیں تھا۔“

”اچھا۔ وہ کیا تھا؟“ وہ تھل سے بولا۔

”وہ.... کسی سڑک کا کنٹینر تھا۔ وہ... وہ سو کر رہا ہوتا تھا۔ کیا آپ اس روشنی کو ہلکا نہیں کر سکتے؟“

”کسی اغوا کار کی شکل دیکھی تھی آپ نے؟“

”نہیں۔ انہوں نے ماسک پہن رکھے تھے۔“

”آف کورس انہوں نے ماسک پہن رکھے تھے۔“ وہ بے زاری چھپا کے بولا۔ ”آپ وہاں سے کیسے بھاگیں؟“

”میں.... پتہ نہیں۔ میں نے ایک دن ایک اغوا کار پہ حملہ کر دیا جب وہ میرے ہاتھ باندھ رہا تھا۔ میں اسے گرا کے باہر

نکل آئی۔ وہ ملا کہ کی کوئی سڑک تھی۔ بس میں وہاں سے بھاگ گئی۔“

”جس سڑک پہ آپ اس کنٹینر سے نکلیں.... وہ سڑک یاد ہے کون سی تھی؟“

”جو ٹکرا سٹریٹ۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”اور کنٹینر کا رنگ کیا تھا؟“

”رنگ؟“ وہ ٹکرا سٹریٹ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”اگر آپ یہ دیکھ سکتی ہیں کہ وہ سڑک کون سی تھی تو یقیناً ایک دفعہ سڑک کے اس کنٹینر کو بھی دیکھا ہوگا جو اتنے سال سے آپ کو

مقید کیے ہوئے تھا۔“

”پتہ نہیں۔ رات تھی۔ میں نے غور نہیں کیا۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ نیلا یا شاید سرخ۔ شاید دونوں رنگ تھے۔“

”اور اس کا نمبر کیا تھا؟ اب یہ مت کہیے گا کہ آپ نے نمبر پلیٹ بھی نہیں دیکھی۔“

”نوہ.... نمبر پلیٹ پہ مٹی لگی تھی.... آخر میں ڈبل سیون آتا تھا۔“

”عصرہ محمود سے آپ کا تعلق کیا تھا؟“

وہ ایک دم چونک کے اسے دیکھنے لگی۔ پھر سیدھی ہو کے بیٹھی۔

”میں اپنے وکیل کی غیر موجودگی میں مزید کچھ نہیں کہوں گی۔“ وہ تیزی سے بولی تو کمشنر ہلکا سا مسکرایا۔ اس نے چند سوال

مزید پوچھے لیکن وہ سختی سے لب آپس میں پیوست کیے بیٹھی رہی۔

اسی اثناء میں دروازہ کھلا اور ایک سپاہی احمد نظام کو ساتھ لیے اندر داخل ہوا۔ تالیہ نے گہری سانس اندر کھینچی۔

”آپ نے کچھ کہا تو نہیں؟“ انہوں نے دوسری کرسی سنبھالتے ہوئے تالیہ کو غور سے دیکھا۔ اس نے بس ابرو اچکا دیے۔

”آپ کی کلائنٹ نے چھ سال تک قید میں رکھے جانے کی ایک فلمی کہانی سنائی ہے جو اگر جھوٹی نکلی تو یہ مزید مشکل میں پڑ

جائیں گی۔“ کمشنر مظلوظ انداز میں بولا تو احمد نظام نے صدمے سے اسے دیکھا۔

”اب آپ خاموش رہیں گی۔“ انہوں نے اسے گھور کے کہا۔ پھر کاغذات سامنے رکھتے ہوئے آفیسر کی طرف گھومے۔

اس نے پھر سے سر جھکا دیا اور آنکھیں سختی سے میچ لیں۔ تیز روشنی کا راستہ اب رک گیا تھا۔

☆☆=====☆☆

اشعر جس وقت گھر میں داخل ہوا ملازم نے اطلاع دی کہ فاتح اس کا اسٹڈی میں انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس لمحے کے لیے تیار

تھا۔ اس لیے راہداری کی سیدھ میں آگے بڑھتا گیا۔ لیکن اسٹڈی میں داخل ہوتے ہی وہاں کا منظر اسے چونکا گیا۔

فاتح اکیلا نہیں تھا۔ اس کے دو قانونی مشیران اس کے سامنے کاغذات اور فائلز پھیلائے بیٹھے تھے۔ وہ ناخوشی سے ان

میں سے ایک کو سن رہا تھا جو بہت فکر مندی سے کہہ رہا تھا۔

”وا تو سری.... آپ ایک قتل کے الزام میں گرفتار ملزمہ سے نہیں مل سکتے۔ یہ بہت بڑا ایٹو بن جائے گا۔“

”میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے تاکہ آپ اس ملاقات کو ریج کریں تاکہ مجھے نصیحت کریں۔“ وہ ماتھے پہ ہل ڈالے

بولا۔ آستین موڑے، ٹانگی ڈھیلی کیے وہ اپنی کرسی پہ بیٹھا شدید برہم نظر آتا تھا۔

”سریہ ناممکن ہے۔ آپ پولیس اسٹیشن گئے تو اسکیڈل بن جائے گا۔ وہ آپ کی مرحومہ بیوی کے قتل کے الزام میں گرفتار

ہے۔ آپ کا اس سے بات کرنا قانونی پیچیدگیوں کا موجب بنے گا۔ اور ہم اسے اس وقت پولیس اسٹیشن سے نکال کے کہیں

اور نہیں لا سکتے۔“

”آپ اس سے ملنا چاہتے ہیں؟“ چوکھٹ پہ کھڑے اشعر نے بے یقینی سے کہا تو فاتح نے برہم نظریں اٹھا کے اسے

دیکھا۔ اشعر کے ناک اور گال پہ بینڈیج لگے تھے۔ اور ایک آنکھ پہ نیل کا نشان تھا۔

فاتح اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ محفل برخاست ہونے کا اشارہ تھا۔ دونوں حضرات اپنی فائلز سمیٹ کے وہاں سے اٹھ

گئے۔

وہ دونوں اکیلے رہ گئے تو اشعر نے دروازہ بند کیا اور اس کے عین سامنے آکھڑا ہوا۔

”آپ کو اب بھی اس سے ہمدردی ہے؟“ اس نے بے یقینی اور غصے سے پوچھا۔

”تم نے اس کے لیے جال تیار کیا اور مجھے بتانا تک مناسب نہیں سمجھا؟ تم مجھ سے پوچھو بغیر اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتے

ہو؟“ وہ اس سے زیادہ غصے سے بولا تھا۔

وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے اور ان کے درمیان فقط ایک میز حائل تھی۔ اسٹڈی کی دیواریں.... کرسیاں... اور

فائلوں کے ڈھیر خاموشی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”وہ میری بہن کی قاتل ہے۔ میں اسے سو دفعہ گرفتار کرواؤں گا۔“ اشعر کی آواز اونچی ہونے لگی۔

”وہی بہن جس کو جعلی پیٹنگ دلوا کے تم زمانے میں بدنام کرنے کا پلان کر رہے تھے؟ اس سب کے باوجود میں نے تمہیں

اتنے سال اپنے ساتھ نہیں رکھا؟“

”اوہ.... اس طرح اس کا دفاع کرنے کا سوچیں بھی مت، وان فاتح۔“ وہ سرخ چہرے کے ساتھ چلایا۔

”اور تم مت بھولو کہ تم کس سے بات کر رہے ہو۔ یہ جو تمہارا مقام اور مرتبہ بنا ہوا ہے نا اشعر، یہ میرے ایک دستخط سے ختم

بھی ہو سکتا ہے۔“ اس نے انگلی سے سینے پہ دستک دے کر غرا کے کہا تو اشعر ایک لمحے کے لیے چپ ہو گیا۔ اس کا چہرہ غصے

سے دہکتا سیاہ پڑنے لگا تھا۔

”تالیہ نے عصرہ کا قتل نہیں کیا تھا۔ تم نے اس کو جتنا نقصان پہنچانا تھا پہنچا لیا۔ مجھے یقین ہے وہ اپنی بے گناہی ثابت کر

لے گی۔ لیکن اب تم اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کرو گے۔“ وہ اسے سختی سے تنبیہ کر رہا تھا۔

اشعر دونوں منٹھیاں میز پہ رکھ کے آگے جھکا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”یہ آپ کی بھول ہے کہ آپ مجھے اپنی بہن کی قاتل کے خلاف کچھ کرنے سے روک سکتے ہیں۔“ پھر زور سے میز پہ ہاتھ

مارا۔

”تو پھر سن لو۔ میں اس کی ہر ممکن مدد کروں گا۔ اور میں اسے جیل سے نکال بھی لوں گا۔ تم مجھے نہیں روک سکو گے۔“

اشعر نے پھر سے میز پہ ہاتھ مارا اور غصے سے تن فن کرتا باہر نکل گیا۔ اپنے پیچھے اس نے دروازہ زور سے بند کیا تھا۔ فاتح

نے نوچنے والے انداز میں ٹائی کھینچی اور فون اٹھالیا۔

”کیا اپ ڈیٹ ہے؟“ کچھ دیر بعد اپنی کرسی پہ بیٹھے وہ سنجیدگی سے فون پہ پوچھ رہا تھا۔ غصہ برہمی سب غائب تھا اور اس

کا انداز اب ٹھنڈا تھا۔

”انٹیر وکیشن جاری ہے۔ اس کا وکیل آچکا ہے۔ وہ قتل کے بارے میں کچھ نہیں بتا رہی۔“

”کون ہے اس کا وکیل؟“

”احمد نظام۔ وہ ایک سابق پراسیکیوٹر تھا اور....“

”میں جانتا ہوں وہ کون ہے۔ کیا اس نے بتایا ہے کہ اتنے سال وہ کہاں تھی؟“ پوچھتے ہوئے اس کی گردن میں گٹٹی سی ابھر

کے معدوم ہوئی۔

”اس کا کہنا ہے کہ اسے انہیں کیا گیا تھا اور اتنے سال قید میں رکھا گیا۔ مگر اس کے انداز سے لگتا ہے وہ جھوٹ بول رہی ہے یا خوف کا شکار ہے۔“

”ہوں۔ مجھے آگاہ کرتے رہنا۔“ اس نے پرسوج نظروں سے دور خلاء میں دیکھتے ہوئے کہا اور فون پرے ڈال دیا۔ ایک دم سے اس کی ساری دنیا ہی تکیٹ ہو کے رہ گئی تھی۔

پچھلے سال بعد وہ واپس آئی تھی۔ پچھلے سال وہ کہاں رہی وہ اس سے کیوں نہیں ملی اور اب اس کی زندگی میں کیا کیا بدل چکا تھا۔۔۔ ان سوالوں کے جوابات صرف تالیہ مراد کے پاس تھے۔ اور اس سے ملاقات کے سارے راستے بند تھے۔

☆☆=====☆☆

سری پر دھانہ کی کھڑکیوں سے چھن کے آتی سرما کی دھوپ سارے آفس کو سینک رہی تھی۔ وان فاتح اپنی کرسی پہ بیٹھا ایک فائل کے صفحے پلٹا تا نظر آ رہا تھا۔ دفعتاً دروازہ کھلا اور سوٹ میں ملبوس شاہد ان اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں آج بھی ایک سیاہ فولڈر تھا۔ وہ فاتح کو مخاطب کیے بغیر آگے آیا اور فولڈر شیلف میں رکھا۔ پھر میز کے سامنے جا کھڑا ہوا اور کھٹکھارا۔ فاتح نے فائلوں سے سرائٹا کیا ایک سوالیہ نظر اس پہ ڈالی۔

”یا بگ دی امان بر حرمت۔۔۔ مجھے آپ کو آگاہ کرنا تھا کہ۔۔۔ آج تالیہ مراد کی عدالت میں پیشی تھی۔ ان کے وکیل نے ضمانت کی درخواست دائر کی تھی۔“

”اور؟“

”ان کی ضمانت عدالت نے منظور کر لی ہے۔ ان کو رہا کر دیا گیا ہے۔“

ایک لمحے کے خاموش وقفے کے بعد فاتح نے سر کو خم دیا اور بولا۔ ”اوکے۔ اور کچھ؟“

”عدالت نے ضمانت کی رقم کافی بھاری مقرر کی تھی۔“

”کس نے رقم ادا کی؟“

”لہنگر پرسن ایڈم بن محمد نے۔ اس نے ٹویٹ کی ہے کہ اس نے تالیہ مراد کی کہانی کے رائٹس خرید لیے ہیں۔“

”ٹرائل کب شروع ہو رہا ہے؟“

”غالباً دو ہفتے بعد۔“

”ہوں۔ سلطان عبدالملک تشریف لے آئے؟“ اس نے واپس کام کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

”قریباً تین منٹ تک وہ پہنچ جائیں گے۔“ شاہد ان نے ایک نظر پیچھے شیلف پہ رکھی سیاہ فائلز کے اکٹھے ہوتے ڈھیر کو

دیکھا۔ پردھان منتری نے ان کو ابھی تک نہیں چھوڑا تھا۔ وہ کچھ کہنے لگا پھر سر جھٹکا اور اجازت لے کر مڑ گیا۔ اس کے جانے کے بعد فاتح نے ریموٹ اٹھایا اور دیوار پہ لگی ٹی وی اسکرین آن کی۔

غالباً ہر چینل ایک ہی خبر دکھا رہا تھا۔ عدالت کے باہر رپورٹرز کے زونے میں تالیہ مراد اپنے وکیل کے ساتھ چلتی باہر آرہی تھی۔ اس نے سیاہ منی کوٹ پہن رکھا تھا۔ آنکھوں پہ سیاہ شیشوں والے گلاسز تھے۔ کھلے بال کندھوں پہ گر رہے تھے۔ گال پہ سرخ بھورا نشان، ماتھے کا بینڈ تاج اور ہاتھ کی پٹی صاف دکھائی دیتی تھی۔

آج وہ کمپوزڈ اور سپاٹ نظر آتی تھی۔ رپورٹرز کے سوالات کی بوچھاڑ پہ سپاٹ چہرہ لیے خاموشی سے آگے بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ ایک کار میں بیٹھ گئی۔ وکیل صاحب بھی ساتھ بیٹھے۔ دروازہ بند ہوا اور کار آگے بڑھ گئی۔ اب رپورٹرز اپنے اپنے کیمروں کی طرف رخ کیے اس کیس کی تفصیلات بتانے لگے۔

اور دان فاتح ایک لمحے کے لیے تالیہ کے سپاٹ چہرے پہ اپنے سوالات کے جوابات ڈھونڈنے لگا۔ اس کے ساتھ چھ سال تک کیا بیتی۔ وہ کہاں تھی۔ اس نے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ کیا وہ اپنے باپ کے پاس رہ گئی تھی؟ اس کے پاس ضائع کرنے کے لیے دوسرا لمحہ نہ تھا۔ اس نے اسکرین آف کر دی اور سامنے رکھے کاغذات کو دیکھنے لگا۔

دفعتاً دروازے کھول دیے گئے۔ دربان نے آ کے اطلاع دی۔

یا نگ دی پر تو ان اگوئنگ (بادشاہ سلامت) تشریف لارہے تھے۔ وہ مسکرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔

”توانگو۔“ کہتے ہوئے تعظیم پیش کی۔

عام دنوں کی نسبت سلطان عہد المملک سادہ سوٹ میں ملبوس تھے۔ سر پہ ٹوپی تک نہ تھی۔ کھجڑی بال، آنکھوں پہ چشمہ اور چہرے پہ مسکراہٹ سجائے وہ آئے۔ شاہی آداب کے بعد دونوں اپنی کرسیوں پہ بیٹھ گئے تو انہوں نے بات کا آغاز کیا۔

”آپ مجھ سے تنہائی میں ملاقات کرنا چاہتے تھے؟“

”جی، توانگو۔ میں خود آ جاتا۔ آپ نے زحمت کی۔“ الفاظ کے برعکس فاتح لاچہرہ سپاٹ اور لہجہ سرد تھا۔

”کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ بتائیں۔ کوئی خاص بات تھی۔“

”توانگو... آپ نے تاریخ کا مطالعہ تو کیا ہوگا؟ میں اکثر کرتا ہوں۔“ وہ میز پہ ہاتھ باہم جما کے رکھے، سکون سے سامنے بیٹھے بادشاہ کو دیکھتے ہوئے اسی سرد لہجے میں کہنے لگا۔ ”قدیم ملاکہ میں سلاطین اپنے دائیں ہاتھ کے طور پہ ایک عہد پدار رکھتے تھے۔ اسے بندابارا کہا جاتا تھا۔ سلطان اور بندابارا دونوں تب تک حکومت میں رہتے جب تک ان کی طاقت مخالفین کی طاقت سے زیادہ رہتی۔ جہاں یہ توازن بگڑتا وہاں ان کا تختہ الٹ جاتا۔“

”میں تاریخ سے واقف ہوں یا نگ دی امان بر حرمت۔“

”پھر آپ اس بات سے بھی واقف ہوں گے کہ جدید دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ جیسے میں پانچ سال کے لیے منتخب ہو کے آتا ہوں ویسے ہی سلطان بھی منتخب ہوتا ہے۔ میرے اور آپ میں فرق ہے تو انکو۔“

”جیسا کہ؟“

”آپ کو بینظیلی (کار) پہ سفر کرنے کی اجازت حاصل ہے۔ لیکن پردھان منتری صرف اپنے ملک کی بنی کار استعمال کر سکتا ہے۔“ وہ سرد مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ سلطان مسکرا دیے اور ابرو اٹھائی۔

”آپ نے صرف یہ فرق جتانے کے لیے تو مجھے نہیں بلایا۔“

”جی تو انکو۔ دوسرا فرق ہم میں یہ ہے کہ پردھان منتری ہمیشہ سلطان سے زیادہ اختیارات رکھتا ہے۔ آپ کا انتخاب تین ماہ قبل ہوا تھا۔ اس سے پہلے آپ ریاست کے حکمران تھے۔ نوریاستوں کے حکمرانوں نے آپ کو چنا اور یہاں تک پہنچایا۔“

”آپ کھل کے بات کریں وان فاتح۔“ وہ مسکرا کے بولا۔

”تو انکو۔“ وہ بھی مسکرایا۔ ”میں جانتا ہوں آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ بھی کہ چار ریاستوں کے سربراہ میرے خلاف آپ کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ صوفیہ رحمن سے آپ کی ہمدردی برقرار ہے۔ اسی لیے میرے بل کو پاس ہونے سے روکنے کے لیے میرے اراکین کو آپ توڑ رہے ہیں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کے توڑ توڑ کے کہہ رہا تھا۔

”اور آپ ان اراکین کو اونچے عہدوں کا لالچ دے کر واپس بلا رہے ہیں۔“

”لوگ مجھ پہ اعتبار کرتے ہیں تو انکو۔ لیکن جن نوریاستوں کے حکمرانوں نے آپ کو سلطان بنایا ہے کیا وہ آپ پہ ہمیشہ اعتبار کرتے رہیں گے؟“

”یہ وقت بتائے گا کہ کون کس کو کرسی سے ہٹائے گا“ دوسری۔“

ایک خاموشی کا وقفہ دونوں کے درمیان حائل ہوا۔ پھر فاتح نے گہری سانس لی اور افسوس سے سر جھٹکا۔

”تو انکو... میں اس ملک کا پردھان منتری اس لیے بننا چاہتا تھا تاکہ میں اس ملک میں نئی پالیسیز لاؤں۔ نئے قوانین بناؤں۔ لیکن آپ لوگ مجھے وہ سب کرنے نہیں دینا چاہتے۔ آپ صرف مجھے نقصان نہیں پہنچا رہے۔ میرے لوگوں کو نقصان دے رہے ہیں۔ اس لیے کتنا اچھا ہو کہ آپ اپنے پانچ سال آرام سے حکومت کریں اور خود کو محلاتی سازشوں سے لاتعلق کر کے اپنے اختیارات انجوائے کریں۔ اور مجھے میرا بل پاس کرنے دیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی اٹھے اور مسکرا کے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

”آپ میری طرف سے فکر مند نہ ہوں، وان فاتح۔ آپ کے بل کے لیے میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔“ پھر بادشاہ سلامت نے اپنے کوٹ کا بٹن بند کیا، نادیدہ شکنیں درست کیں اور ایک نظر کوٹنے میں لگے بورڈ کو دیکھا جو ابھی کور سے ڈھانکا ہوا تھا۔

”ان شاء اللہ اکثریت آپ کے ساتھ ہوگی۔“

”آپ پر دھان استرا انجوائے کریں، تو انکو۔ یہ کنٹھن کام میرے لیے چھوڑ دیں۔“ وہ سرد مسکراہٹ کے ساتھ بولا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

پیچھے شیلف پر رکھی سیاہ فائلیں اداسی سے ان دونوں کو مصافحہ کرتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ جانے وہ ہاتھ انہیں کب چھوئیں گے؟ وہ انتظار کر رہی تھیں۔

☆☆=====☆☆

احمد نظام ڈرائیو کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی، کھڑکی سے باہر بھاگتے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔

”کم از کم میں آزاد ہوں۔“ کچھ دیر بعد وہ بولی تو انہوں نے برہمی سے اسے دیکھا۔

”لیکن آپ نے اپنا کیس مزید خراب کر دیا ہے، تالیہ۔“ وہ برہمی سے بولے۔ کل سے اس پہ آیا غصہ بالآخر نکل آیا۔ ”میرے آنے سے پہلے آپ کو خاموش رہنا تھا۔ آپ کو اپنی کمشدگی کی اتنی لمبی اور بے سرو پا کہانی سنانے کی ضرورت نہ تھی۔“

”میں panic کر گئی تھی... او کے؟ مجھے انٹرو گیشن روم اور ان کی تیز روشنیوں کا فوبیا ہے۔ مجھے پولیس کی قید میں جانے سے اس وقت سے ڈر لگتا ہے۔ میں ابھی تک اس چیز کو ہینڈل نہیں کر پا رہی۔ او کے؟ او کے؟“ وہ باہر دیکھتے ہوئے بولی۔

”آپ کی کہانی آپ کو مزید گھٹی ثابت کر دے گی، تالیہ۔ آپ کو سچ بولنا چاہیے تھا۔“

”سچ پہ کوئی بھی یقین نہ کرتا۔ آپ بھی نہیں۔ انجوائی اسٹوری بہتر تھی۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں نکلتا۔“ وہ شانے اچکا کے بولی۔ احمد نظام نے تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے موڑ کاٹا۔

”آپ کے خیال میں وہ اس اسٹوری کو چیک نہیں کریں گے؟ وہ ایسا کنٹینر نہیں تلاش کریں گے؟ وہ آپ کے ان تین چار دنوں کی ساری فوئجز نکالیں گے۔ وہ آپ کے ہر قدم کو ریٹریس کریں گے۔“

”ہاں تو میرے انجوائی کارٹنڈ تھے نا۔ انہوں نے اب تک کنٹینرز کو آگ لگا دی ہوگی یا اسے پانی میں بہا دیا گیا ہوگا۔“

”آپ کس زمانے میں رہ رہی ہیں۔ اتنا ہائی پروفائل کیس ہے یہ۔ وہ شہر کا ایک ایک کنٹینر ڈھونڈیں گے۔“

”زمانے سارے ایک سے ہی ہوتے ہیں‘ نظام صاحب۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ وقت مجھ پہ بہت مہربان رہا ہے۔“ وہ تلخی سے کہہ کے کھڑکی سے باہر روشنی میں نہائے کے ایل کو دیکھنے لگی۔ آج پہلی دفعہ... اتنے عرصے بعد... وہ تیز روشنی میں بغیر خوف کے شہر کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ کو پی ایم سے ملنے جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔“

”اُس فنی... اب ہر کوئی ان کو پی ایم کہتا ہے حالانکہ ان کا نام وان فاتح ہے۔ اور اچھا ہی ہونا میں گرفتار ہو گئی۔ یوں میری ضمانت بھی ہو گئی اور اب میں آزادی سے گھوم پھر سکتی ہوں۔“

”اور میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کا کیس لے کر میں نے غلطی تو نہیں کر دی۔“ تالیہ نے خفگی سے انہیں دیکھا لیکن وہ اب ایک عمارت کے سامنے کار روک کے موضوع تبدیل کر گئے تھے۔

”میں نے اس بلڈنگ میں آپ کے لیے دو کمروں کا ایک اپارٹمنٹ کرائے پہ لے لیا ہے۔ آپ یہاں بہتر محسوس کریں گی۔ آپ کا سامان بھی موٹل سے اٹھوا کے یہاں منتقل کر دیا گیا۔“ ایک کی کار ڈاس کی طرف بڑھا دیا۔

”شکریہ۔ آپ تمام اخراجات میرے بل میں ڈال دیجئے گا۔“ وہ دروازہ کھول کے باہر نکلی اور سن گلاسز ماتھے پہ چڑھا کے گردن اٹھائے اس اونچی عمارت کو دیکھا۔

”میں پہلے ہی ڈال چکا ہوں۔ ابھی آپ آرام کریں۔ کل میرے آفس آئے گا۔ ہم آپ کے کیس پہ کام کریں گے۔“ اس نے چہرہ موڑ کے انہیں دیکھا اور آزدگی سے مسکرائی۔ ”بہت شکریہ احمد نظام صاحب۔ میری مدد کے لیے۔“

”میں نے کہا نا میں آپ کے بل میں ساری رقم ڈال چکا ہوں۔ ایڈم بھی صبح آفس آئے گا۔ تب تک آپ آرام کریں۔“ وہ ہینڈ بیگ لیے آگے بڑھی اور عمارت کے قریب آئی۔ خدا کار دروازے کھلتے چلے گئے۔ لیکن تالیہ اندر نہیں گئی۔ وہ رک کے اس سوٹ میں ملبوس آدمی کو دیکھنے لگی جو اس کی طرف آ رہا تھا۔ تالیہ نے دیکھا اس کے پیچھے ایک سیاہ شیشوں والی لمبی سی کار کھڑی تھی۔

(ابھی میں اس نئے گھر میں داخل بھی نہیں ہوئی اور ان کو پہلے سے خبر ہو گئی۔)

”جے تالیہ۔“ اس نے قریب آ کے سر جھکا کے سلام کیا۔ ”میں سری پردھانہ سے آیا ہوں۔ آپ کی پی ایم کے ساتھ اپارٹمنٹ ہے۔ انہوں نے آپ کو بلایا ہے؟“

”ابھی؟“

”نہیں۔ کل صبح۔“

تمہارا نام کیا ہے؟“ اس نے سنجیدگی سے اس نوجوان کو دیکھا۔
 ”سریش۔“

”سریش... اپنے پردھان منتری سے کہو، تالیہ مرادان سے نہیں ملنا چاہتی۔“
 سریش ٹکڑ ٹکڑ اس کا چہرہ دیکھنے لگا جیسے اس جواب کی امید نہ ہو۔
 ”چے تالیہ... میں ان کو آپ کے انکار کی کیا وجہ بتاؤں؟“

”ان سے پوچھنا کہ وہ مجھ سے ملنے حوالات میں کیوں نہیں آئے؟“
 ”گستاخی معاف، چے تالیہ، لیکن ملک کا حکمران ایک قیدی سے ملنے نہیں آ سکتا۔“
 ”اچھا؟“ اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ ”میں تو آئی تھی۔“ جتنا کہ بولی اور مڑ گئی۔ سرکاری اہلکار بے بسی سے اسے جاتے دیکھتا رہا۔

”اور پھر میری بات کے جواب میں انہوں نے کہا کہ میں تو آئی تھی۔“
 قریباً گھنٹے بعد سریش ہاتھ باندھے اپنے پی ایم کے سامنے کھڑا، ساری بات شرمندگی سے بتا رہا تھا۔ وہ سن کے ہلکا سا مسکرا دیا۔ وہ درست کہہ رہی تھی۔ وہ آئی تھی۔ جب وہ مراد راجہ کی قید میں تھا اور اس کا ماتھا چہرہ اور ہاتھ اسی طرح زخمی تھا۔ تب وہ آئی تھی اس سے ملنے اور اس نے کسی روکنے والے کے روکنے کی پرواہ نہیں کی تھی۔ لیکن وہ نہیں جاسکتا تھا۔
 ڈیم ڈیمو کر لیں۔

”سر... آپ نے جو وقت کل صبح مس تالیہ کے لیے مختص کرنے کو کہا تھا، اسے کینسل کر دوں؟“
 ”ہاں۔“ اس کے جواب پہ سریش نے سر ہلا دیا۔ وہ جانے کے لیے مڑنے لگا جب فاتح بولا۔
 ”اے سوموار کی صبح کا وقت دے دو۔“

سریش تعجب سے واپس گھوما۔ فاتح اب سامنے رکھی فائل کی طرف متوجہ تھا۔
 ”لیکن... سر... سوری لیکن... انہوں نے تو ملنے سے انکار کر دیا ہے۔“

وان فاتح نے چہرہ اٹھا کے سنجیدگی سے دیکھا۔ ”نہیں۔ اس نے انکار نہیں کیا۔ اس نے تم سے پوچھا ”ابھی؟“ تم نے کہا، کل صبح۔ اے کل صبح کوئی اہم کام کرنا ہوگا اس لیے سوموار کا وقت دے دو۔“

”اوکے... میں...“ وہ گڑبڑا کے بولا۔ حیران نظریں ابھی تک پردھان منتری پہ جمی تھیں۔ ”میں خود جاؤں ان کے پاس یا ان کو کال کر لوں؟ میرے پاس ان کا نمبر ہے۔“

”کال کرو۔ اسی لیے اس نے تمہارا نام پوچھا تھا تا کہ تم کال کرو تو وہ پہچان جائے۔“ وہ فائل کے صفحے پلٹاتے ہوئے اب کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ سریش نے آہستہ سے سر ہلایا اور مڑ گیا۔ دنیا عجیب لوگوں سے بھری پڑی ہے۔

”میں نے آپ کو بتایا تھا سریش مجھے ان سے نہیں ملنا۔“

”منڈے مارنگ۔ صبح آٹھ بجے میم۔ میں سری پر دھانہ کے باہر آپ کا منتظر ہوں گا اور آپ کو سیکورٹی سے گزار کے اندر لے جاؤں گا۔“

تالیہ نے مسکرا کے فون بند کیا۔ (وہ اب بھی اس کو بہت اچھے سے جانتا تھا۔ اس دفعہ ان فاتح کچھ نہیں بھولا تھا۔) وہ اپنے اپارٹمنٹ کے لونگ روم کی کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی۔ شہر کی اونچی عمارتیں اور سڑکوں پہ بہتا ٹریفک... یہاں سے سب دکھائی دیتا تھا۔ فون رکھ کے اس نے بازو سینے پہ باندھ لیے اور اس خوبصورت شہر کو دیکھنے لگی۔

اس شہر میں آج تالیہ مراد کے کیس کا چرچہ ہو گا اور جب تک ٹرائل چلے گا اس شہر میں تالیہ کے جرم کی ہی باتیں ہوں گی۔ چھ برس پرانا کیس زندہ ہو گیا تھا۔ بلاگز، چینلز، کیفے... ہر جگہ یہی ذکر چھڑ چکا تھا۔

وہ خاموشی سے نیچے نظر آتے شہر کو دیکھے گی۔ گھڑی کی سوئی تک تک کرنی آگے بڑھ رہی تھی۔

☆☆=====☆☆

وان فاتح کی رہائش گاہ پہ ناشتے کی میز پہ آج صبح تناؤ پھیلا تھا۔ فاتح جب اپنی سربراہی کرسی پہ آ کے بیٹھا تو اس نے ایک نظر تمام افراد پہ ڈالی۔ سکندر کے ماتھے پہ بل تھے اور وہ خاموشی سے سیریل کھا رہا تھا۔ جولیا نے اپنے ناشتے سے کھیلتی گم صم نظر آتی تھی۔ اور اشعر... وہ بالکل سپاٹ بیٹھا تھا۔

”آج تمہارا کالج نہیں ہے سکندر؟“ اس نے بات کا آغاز کرتے ہوئے دلے کا پیالہ اپنے قریب کیا تو سکندر نے نظریں اٹھا کے برہمی سے اسے دیکھا۔

”آپ کو ابھی بھی تالیہ مراد سے ہمدردی ہے؟“

فاتح نے پیالہ واپس دھکیلا اور سنجیدگی سے سکندر کو دیکھا۔ ”تالیہ نے عصرہ کا قتل نہیں کیا تھا۔“

”یہ اسی نے کیا تھا ڈیڈ۔ آپ اس کا دفاع نہیں کر سکتے۔“

”تم چاہتے ہو کہ میں ایک بے قصور لڑکی کو مجرم کہوں؟ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ سوری۔“

”ہم اچھی زندگی گزار رہے تھے۔“ سکندر درشتی سے بولا اور نیپکن پر سے پھینکا۔ ”پھر وہ ہماری زندگیوں میں آئی۔ مجھے

سب یاد ہے۔ اس کی وجہ سے آپ دونوں کی لڑائی ہوتی تھی۔ اس کی وجہ سے سب کی لڑائی ہونے لگی تھی۔“ اس نے شکوہ کنناں

نظروں سے اشعر کو دیکھا۔ وہ باری باری باپ بیٹے کے چہرے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کورٹ میں ایک سرے سے دوسرے تک اڑتی گیند دیکھ رہا ہو۔

”اور پھر میری ماما مر گئیں۔ اس کی وجہ سے ہمیں گھر چھوڑنا پڑا۔ ہمیں اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔ آپ نے آج تک اس کو مجرم نہیں کہا۔ ہمیشہ اس کو ڈیفینڈ کیا۔ لیکن اب آپ اس کو ڈیفینڈ نہیں کریں گے ڈیڈ۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ اگر کسی نے اس گھر میں تالیہ مراد کی حمایت کی تو میں گھر چھوڑ کے چلا جاؤں گا۔“

اس نے کرسی دھکیلی اور سرخ چہرے کے ساتھ کہتا ہر چلا گیا۔ جولیانہ سر جھکائے کھاتی رہی۔ فاتح نے گردن موڑ کے چبھتی ہوئی نظروں سے اشعر کو دیکھا۔

”تم نے کچھ کہا ہے سکندر کو؟“

وہ سیب میں دانت گاڑتے ہوئے کندھے اچکا کے بولا۔ ”اس کی عمر دیکھیں۔ کیا میں اس کا برین واش کروں گا؟ وہ اس کی ماں تھی۔ میری بہن تھی۔ وہ وہی محسوس کر رہا ہے جو میں کر رہا ہوں۔ دیکھیں آہنگ۔“ اس نے سیب رکھا اور سنجیدگی سے بولا۔

”میں آپ کا ذہن نہیں بدل سکتا۔ میں آپ کی رائے کو برداشت کروں گا۔ لیکن آپ ہمارے جذبات کو برداشت کریں۔ ہم میں سے کوئی اب اس قصے کو گھر میں ڈسکس نہیں کرے گا۔ معاملہ عدالت میں ہے۔ جو فیصلہ عدالت کرے گی وہ ہم سب کو قبول کرنا ہوگا۔“

فاتح نے خاموشی سے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ اسی وقت مرکزی دروازہ کھلا اور میثا کا شنا سا چہرہ دکھائی دیا۔ جولیانہ نے سر موڑ کے اسے دیکھا اور تیزی سے ناشتہ ختم کرنے لگی۔ میثا قریب آئی۔ اس کے جوتوں کی ٹک ٹک واحد آواز تھی جو سارے میں سنائی دے رہی تھی ورنہ ڈائینگ ہال کا تناؤ دور سے بھی محسوس کیا جاسکتا تھا۔

”جولیانہ آپ نے ناشتہ نہیں کیا؟ کلاس کا وقت ہونے والا ہے۔“ سلام اور تعظیم کے بعد میثا تعجب سے کہتی جولیانہ کی کرسی کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ جولی نے جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ کھاتی رہی۔ فاتح نے نظر اٹھا کے دیکھا۔

”جولی... آپ کی ٹیچر کچھ پوچھ رہی ہیں۔“

”اٹس اوکے۔ میں کتابیں یہیں لے آتی ہوں۔ ساتھ ہی اس کو پڑھا بھی دوں گی۔“ میثا نے اپنا بیگ اور پرس میز پر رکھے اور اجازت لے کر اسٹڈی کی طرف چلی گئی۔

میثا کے جاتے ہی اس کا فون زور زور سے تھر تھرانے لگا۔ جولیانہ نے اسکرین دیکھی اور واپس دلیہ کھانے لگی۔ چند لمحوں

خاموشی سے گزرے۔ یہاں تک کہ تھر تھرانے کی آواز ناشتہ کرتے افراد کو کوفت میں مبتلا کرنے لگی۔
 ”جاؤ جولی... اس کوفن دے آؤ۔“ اشعر نے جولیانا کو مخاطب کیا۔ اس نے کندھے اچکا دیے۔
 ”وہ اٹینڈ نہیں کریں گی۔ ان کے ایکس ہز بنڈ کافون ہے۔ وہ اسے کبھی اٹینڈ نہیں کرتیں۔“
 ایک دفعہ پھر خاموشی چھا گئی۔ پھر یکے بعد دیگرے اشعر اور فاتح اٹھ کے باہر چلے گئے۔

میشا کتابیں لیے واپس آئی تو فون ابھی تک تھر تھرا رہا تھا۔ اس نے کتابیں رکھیں اور فون اٹھایا تو چہرے کی رنگت ایک دم بدلی۔ خوف سے نہیں۔ افسوس سے۔ آزر دگی سے۔ اس نے لب کاٹتے ہوئے کال کاٹی اور فون پرس میں ڈال دیا۔ پھر کرسی کھینچ کے بیٹھی اور کتابیں کھول لیں۔

جولیانا نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ ”آپ میرے ڈیڈ سے کیوں نہیں کہتیں کہ وہ آپ کی مدد کریں۔ مجھے ایکی نے بتایا ہے کہ اس کے باپا پھر سے آپ لوگوں کو ہراس کرنے لگے ہیں۔“
 ”ایسی کوئی بات نہیں ہے جولی۔“ اس نے نرمی سے اس کا سر تھپکا۔ ”میں کوئی کمزور عورت تھوڑی ہوں جو ڈر جاؤں گی؟ وہ زمین کے کوئی ایسے کاغذات مانگتا ہے جو میرے پاس نہیں ہیں۔ میں اسے اگنور کروں گی۔ خود ہی پیچھا چھوڑ دے گا۔“
 ”تو پھر چھ ماہ سے کیوں نہیں چھوڑا؟“

”میں ہینڈل کر لوں گی۔ سنگل مدرز میں بہت طاقت ہوتی ہے جولی۔“ وہ مسکرا کے اسے سمجھانے لگی۔ ”بلکہ ساری ماؤں میں ہوتی ہے۔ اور میں نہیں چاہتی کہ تم سے تعلق کی وجہ سے تمہارے خاندان سے کوئی فیور لوں۔ یہ اخلاقی لحاظ سے اچھی بات نہیں ہے۔“

”ساری مائیں ایک جیسی ہوتی ہیں؟“ جولیانا نے آزر دگی سے اسے دیکھا۔ میشا نے مسکراتے ہوئے سر جھکایا اور ایک صفحے پہ کچھ انڈر لائن کرنے لگی۔ وہ دونوں ڈائیننگ ہال میں اب تنہا رہ گئی تھیں۔
 ”کیا ساری مائیں بہادر ہوتی ہیں؟“ وہ آہستہ سے بولی تو میشا نے چونک کے اسے دیکھا۔ پھر اس کے چہرے پہ فکر مندی پھیلی۔

”اوہ سوئی... کوئی کتنا بھی مضبوط ہوا اسے نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔ تمہاری ماما بھی اسی کا شکار ہوئی تھیں۔ مت سوچو اس بارے میں۔“

جولیانا نے پلکیں جھپکتے ہوئے اسے دیکھا۔ آواز مزید دھیمی کی۔

”آپ کو کیا لگتا ہے تالیہ مراد نے میری ماما کو مارا ہوگا؟“

میشا نے گہری سانس لی۔ آج وہ شہدرنگ بالوں کو جوڑے میں باندھے ہوئے تھی اور ایک گھٹکھریالی لٹ گال پہ جھول رہی تھی۔

”سوئی..... ہمیں نہیں معلوم کس کی کیا اسٹوری ہے۔ جس نے بھی ایسا کیا ہو اس کو سزا ضرور ملے گی۔ اور تم فکر نہ کرو۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تمہارے ڈیڈ ہیں ماما تمہاری حفاظت کے لیے۔“ وہ اسے پیار سے سمجھا رہی تھی۔ اسے واقعی یہ لگا تھا کہ جولیا نہ ایک ”قاتل“ کے واپس آنے پہ خوفزدہ ہے۔ مگر جولیا نے لب کائے اور چہرہ اس کے قریب کیا۔ پھر سرگوٹی میں بولی۔

”کیا میں آپ کو ایک سیکرٹ بتا سکتی ہوں؟“

میشا دم سا دھسے رہ گئی۔ کچھ تھا اس کے انداز میں جوا سے چونکا گیا تھا۔

”تالیہ نے میری ماما کو نہیں مارا تھا۔“

میشا کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا کہے۔ ”تمہیں کیسے پتہ؟“

”دو سال پہلے.... جب مجھے ان چیزوں کی بہتر سمجھ آنے لگی.... تو میں نے ماما کی کیس فائلز پڑھنا شروع کیں۔ پولیس

رپورٹ کے مطابق زہریک کی آئنگ میں تھا۔ یعنی اس پہ چھڑکا گیا تھا۔“

”جولی.... تم ان باتوں میں نہ الجھو۔ عدالت....“

”آپ مجھے کیا سمجھتی ہیں؟ میں مرڈر مسٹریز دیکھتی ہوں۔ مجھے ان سب باتوں کی سمجھ آتی ہے۔ میری بات سنیں۔ مجھے ڈیڈ

کی طرح خاموش نہ کرائیں۔ وہ ایک بے شک تالیہ بھیجتی تھی۔ ماما یہی کہتی تھیں۔ لیکن مجھے یاد ہے۔ وہ چاکلیٹ کیکس

تھے۔ ان پہ آئنگ نہیں ہوتی تھی۔ میں نے دو دفعہ خود ایک وصول کرتے دیکھا تھا ماما کو۔ لیکن بعد میں جب ماما ایک فریج

میں رکھ دیتی تھیں ڈیڈ کے لیے.... تو ان پہ آئنگ ہوتی تھی۔“ اس کی گلابی پڑتی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”مجھے نہیں پتہ وہ

آئنگ کون چھڑکتا تھا لیکن اگر زہریک میں تھا تو وہ تالیہ نے نہیں چھڑکا تھا۔“

میشا دھک سے رہ گئی۔ بالکل گنگ اور ششدر۔

”اس وقت شاید مجھے اتنی سمجھ نہیں تھی۔ لیکن جب میرے ذہن نے کڑیاں جوڑیں تو مجھے سب کچھ پھر سے یاد آنے

لگا۔ میں نے ڈیڈ کو بتایا تھا۔“

”انہوں نے کیا کہا؟“

”انہوں نے مجھے چپ رہنے کو کہا۔ وہ شاید پہلے سے جانتے تھے سب۔“

”یعنی.... تالیہ نے یہ قتل نہیں کیا تھا؟“ وہ گنگ رہ گئی۔ ”اوہ گاڈ... اور تمہارے ڈیڈ نے کچھ نہیں کیا۔ وہ لڑکی چھ سال تک پولیس سے اس جرم کی وجہ سے چھپتی رہی جو اس نے کیا ہی نہیں تھا؟“ اس نے ماتھے کو چھوا۔ ”اوہ بے چاری تالیہ۔“ پھر اس نے جولیانا کا چہرہ دیکھا تو فوراً خود کو سنبھالا۔

”دیکھو جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ یہ وقت ان باتوں پہ غور کرنے کا نہیں ہے۔ تم ایگزام دے کر آؤ پھر ہم بات کریں گے۔ ٹھیک ہے؟“ نرمی سے اسے پکارتے ہوئے بولی البتہ اس کی آنکھوں میں واضح اضطراب نظر آتا تھا۔ جولیانا نے اداسی سے کتاب پہ سر جھکا دیا۔ میٹھا کا ایک ہاتھ ابھی تک سینے پہ تھا۔ یہ سب کچھ نہایت غیر متوقع تھا۔ اسے کیا کرنا چاہیے؟

☆☆=====☆☆

احمد نظام کا آفس بہت بڑا نہ تھا۔ اس میں فائلوں اور کتابوں کے ڈھیر لگے تھے۔ آفس کی حالت کو دیکھ کے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک ہائی پروفائل کیس لینے میں کیوں دلچسپی رکھتے تھے۔

اس وقت وہاں کافی کی مہک پھیلی تھی۔ تین بھاپ اڑاتے کپ میز پہ رکھے تھے۔ ایک طرف احمد نظام خود بیٹھے تھے اور ان کے سامنے تالیہ اور ایڈم کرسیوں پہ براجمان تھے۔ آج وہ سفید اور سیاہ اسکرٹ بلاؤز میں ملبوس تھی۔ ماتھے پہ بینڈ تاج تھا اور گال کے زخم پہ مرہم لگا تھا۔ آنکھ کا نیل میک اپ سے ہلکا کر رکھا تھا۔

”آپ کو یہ چوٹ کیسے آئی؟“ ایڈم نے اپنا کپ اٹھاتے ہوئے اس کے ماتھے کی طرف اشارہ کیا۔

اس سوال پہ تالیہ نے براجمان کے اسے دیکھا۔

”آپ بات بدل رہے ہیں۔ میں کہہ رہی ہوں کہ عصرہ نے یہ خود اپنے ساتھ کیا تھا۔“

”اور میں کہہ رہا ہوں کہ کوئی اس پہ یقین نہیں کرے گا۔ اگر آپ یہ بات لوگوں کے سامنے دہراتی رہیں گی تو آپ ولن لگیں گی۔ عوام بالخصوص عصرہ کے بچے آپ کو معاف نہیں کریں گے۔“ وہ تبصرہ کرنے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

”عصرہ کے بچے۔“ وہ خاموش ہو گئی۔ ان کو وہ فراموش کر گئی تھی۔ وہ اس سارے معاملے کے معصوم ترین متاثرین

تھے۔ ”اوکے۔ میں کسی کو نہیں کہوں گی۔ مگر میں آپ کے سامنے تو کہہ سکتی ہوں نا؟“

”ٹھیک ہے تالیہ۔“ احمد نظام نے مداخلت کی۔ ”مان لیا کہ عصرہ نے خودکشی کی تھی۔ لیکن ہمیں یہ بات ثابت کرنی پڑے

گی۔“

”میرے پاس ایلی بائی ہے۔ جب کیک آنا شروع ہوئے تو میں مصر میں تھی۔“

”کیک آپ کے کریڈٹ کارڈ پہ آرڈر کیے گئے تھے۔ آپ یہ کام دنیا میں کہیں سے بھی بیٹھ کے کر سکتی ہیں۔“ ایڈم نے

گھونٹ بھرتے ہوئے پھر سے تبصرہ کیا۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا ساتھ ہی اپنے فون سے بھی کھیل رہا تھا۔

”اور میں مصر میں بیٹھ کے کیک میں زہر کیسے ملا سکتی ہوں؟“

”چھ سال پہلے اگر آپ فرار نہ ہوتیں تو یہ بات ثابت کرنا آسان تھا۔“ احمد نظام نے مداخلت کی۔

”میں فرار تھوری ہوئی تھی۔ میں اغوا ہوئی تھی۔“ ہالوں کو جھجکا دیا اور کندھے اچکائے۔

ایڈم زور سے ہنسا۔ پھر چہرہ سنجیدہ بنایا اور موبائل پہ مٹن دبانے لگا۔ تالیہ نے برامان کے اسے دیکھا۔

”اس میں اتنا فنی کیا ہے؟“

”مس مراد... آپ کی اغوا والی کہانی بہت کمزور ہے۔ آپ تھوڑا وقت صرف کر کے اس سے بہتر کہانی بنا سکتی تھیں۔“

”آپ تھوڑا وقت صرف کر کے میرے سوال کا جواب دیں۔ میں مصر میں بیٹھ کے کیسے کیک میں زہر ملا سکتی ہوں؟“

”عصرہ کی موت والے دن آپ کے ایل میں تھیں۔ اس سے پہلے جو کیکس آپ نے بھیجے... ان میں زہر...“ ایڈم نے رک کے سوچا۔... ”یہی نہیں آپ کا کوئی ساتھی ملاتا ہوگا۔ استغاثہ یہی نقطہ لائے گا۔“

تالیہ نے کپ نیچے رکھا اور تیزی سے بولی۔ ”اور یہی میں کہہ رہی ہوں۔ عصرہ کا کوئی ساتھی ضرور ہوگا۔“

”کوئی ایسا ساتھی جس نے آپ کا کارڈ نمبر حاصل کر لیا ہوگا۔“ ایڈم بھی ایک دم موبائل رکھ کے سیدھا ہو کے بیٹھا۔ ”اس نے ہی بیکری پہ آرڈر دیا ہوگا۔ اس نے ہی عصرہ کو آر سینک لا کر دیا ہوگا۔ عصرہ اسے کیک پہ خود چھڑکتی ہوں گی۔“ وہ قدرے جوش سے کہہ رہا تھا۔ ”کہانی اچھی جا رہی ہے۔ بھلے جج ہو یا نہ ہو۔“

”مسئلہ یہ ہے کہ...“ احمد نظام کھٹکھارے۔ ”وہ بیکری اب بند ہو چکی ہے۔ مگر اس زمانے میں تفتیش کے دوران جو آئی پی لوکیشن ملی تھی جہاں سے تالیہ کا کارڈ استعمال کیا گیا تھا وہ پراکسی لوکیشن تھی۔ یعنی یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ لوکیشن ملایشیا کی تھی یا باہر کے کسی ملک کی۔“

”اور کسی نے اس پراکسی کو بے نقاب کرنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔“ ایڈم مسکرا کے بولا۔ ”مجھے اس آئی پی کی تفصیلات دیں۔ میں ایک ساہرا نوٹسٹی گیٹشن ایجنسی سے بات کرتا ہوں۔ وہ شاید اصل لوکیشن کو ٹریس کر سکیں۔“

”یعنی جس شخص نے میرا کارڈ استعمال کیا ہے اس کی لوکیشن معلوم ہو سکے گی؟“ پھر اس کا چہرہ بچھا۔ ”کیا معلوم اب وہ وہاں رہتا ہی نہ ہو۔ چھ سال میں تو دنیا بدل جاتی ہے۔ ار کیا پتہ اس نے یہ کام کسی انٹرنیٹ کیفے سے کیا ہوگا۔ عصرہ نے اتنا کچا کام نہیں کیا ہوگا۔“ وہ نفی میں سر ہلاتی کہہ رہی تھی۔ ایڈم نے غور سے اسے دیکھا۔

”آپ کو کیوں لگتا ہے کہ عصرہ نے ایسا کیا تھا؟ کیا ان کی کسی بات سے آپ کو لگا؟“

وہ رکی اور گھور کے اسے دیکھا۔ ”کاش کہ آپ کو کچھ یاد ہوتا۔ خیر.. عصرہ اور میرے تعلقات اس وقت تک بہت خراب ہو چکے تھے۔ اس لیے بعد میں مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کام عصرہ کا ہی ہے۔“

”کب؟ آپ کے عصرہ سے تعلقات کب خراب ہوئے تھے؟“

”قتل سے دو ایک ماہ پہلے سے۔“

”ایک منٹ۔ ایک کب سے آنے لگے تھے؟“ ایڈم نے ایک فائل اٹھائی اور تاریخ پڑھی۔ ”ایک بھیجنے سے پہلے کسی دن کچھ ہوا ہو گا جو عصرہ نے اتنا بڑا فیصلہ کیا۔ آپ کو اپنا اور ان کا کوئی شدید جھگڑا یاد ہے جس کے بعد انہیں زندگی اور آپ دونوں سے نفرت محسوس ہوئی ہو؟“

”پارٹی.... ایک پارٹی میں....“ تالیہ نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ ”جب میں نے عصرہ کو بتایا تھا کہ وہ فاتح کی پہلی....“ اس نے اگلے الفاظ دبالیے۔ مگر اسے یاد آچکا تھا۔ وہ آتش بازی والی پارٹی جب عصرہ نے ان دونوں کو ساتھ دیکھا تھا۔

”تاریخ یاد ہے آپ کو؟ چھ سال گزر چکے ہیں اس لیے....“

”اوہ۔ میرے لیے وہ تین ماہ پہلے کی بات ہے ایڈم صاحب۔“ اس نے موبائل اٹھایا اور تیزی سے بٹن دبائے لگی۔ پھر اسکرین اس کے سامنے کی۔ ”یہ میرا اس وقت کا ٹوٹرا کاؤنٹ ہے۔ میں نے اس شادی کی تصویر ٹویٹ کی تھی۔“

ایڈم نے جھک کے تاریخ پڑھی۔ ”یہ ایک آنے سے ایک ہفتہ پہلے کی تاریخ ہے۔“

”اس سے کیا ثابت ہوتا ہے ایڈم صاحب؟“ احمد نظام نے غور سے اسے دیکھا۔

”اس پارٹی سے لے کر.... پہلے ایک کے آنے تک۔ عصرہ محمود نے کیا کیا تھا۔ ہمیں عصرہ کے ہراسٹپ کوری ٹریس کرنا ہے۔ ان کے کریڈٹ کارڈ کا بل، بینک اکاؤنٹ ڈیٹیلز.... فون ریکارڈ.... آپ کو وہ سب نکلوانا ہو گا۔ اگر عصرہ نے خودکشی کی تھی... اگر.... (زور دیا) تو اس کا پلان انہوں نے انہی سات دنوں میں بنایا ہو گا۔“

”اور اگر عصرہ نے کیش ادا کیا ہو؟ اگر انہوں نے کسی دوسرے نمبر سے بات کی ہو؟ اگر....“ تالیہ کے تاثرات دیکھ کے وہ خاموش ہوئے اور سر ہلایا۔ ”میں ریکارڈ نکلواتا ہوں۔“ وہ فون اٹھا کے باہر نکل گئے۔

آفس میں خاموشی چھا گئی۔ پھر ایڈم کھٹکھارا اور قدرے بے نیازی سے بولا۔ ”مس مراد.... یہ سب اس پہ منحصر ہے کہ عصرہ نے خودکشی کی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہم آپ کی مدد نہیں کر سکیں گے۔“

تالیہ نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔ ”آپ کی رائیٹنگ کیسی جارہی ہے؟“

وہ اس سوال پہ حیران ہوا۔ ”بہت اچھی۔ کیوں؟“

”آپ نے کافی عرصے سے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ آپ نئی کتاب کے بارے میں معلومات بھی نہیں دے رہے۔ فیئر سمجھ رہے ہیں کہ آپ سر پرانز دیں گے لیکن جس خوشی سے آپ نے تالیف مراد کی کتاب لکھنے کی خبر کو عام کیا ہے.... مجھے لگتا ہے آپ رائٹرز بلاک کا شکار ہیں۔ آپ کوئی دوسری کتاب لکھ ہی نہیں رہے تھے۔“

”یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔“ اس نے پہلو بدلا۔ ایک دم وہ بالکل سنجیدہ ہو گیا تھا۔

”یعنی آپ مان رہے ہیں کہ آپ کو کوئی مسئلہ لاحق ہے؟“ وہ کرسی کا رخ اس کی طرف موڑنے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھی اس کی آنکھوں میں جھانک کے کہہ رہی تھی۔ ایڈم نے پتلیاں سکوڑ کے اسے دیکھا۔

”مس مراد.... کتنا اچھا ہو ہم ایک دوسرے کی ذاتی زندگیوں میں مداخلت نہ کریں۔ میں انسپریشن سے لکھتا ہوں اور...“

”آپ ہاول کیوں نہیں لکھتے؟“

ایڈم بولتے بولتے رکا۔ ”میں فکشن رائٹر نہیں ہوں۔“

”آپ کا ذہن ایک ہی طرح کی سیاسی چیزیں لکھ کے بور ہو چکا ہے۔ آپ کو چینج چاہیے۔“

وہ چپ ہو گیا۔ پھر قدرے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”میرا نہیں خیال کہ میں اچھا فکشن لکھ سکتا ہوں۔“

”تو برا فکشن لکھ لیں۔ کم از کم قلم کی رکاوٹ تو ختم ہوگی۔“

”اچھا؟ اور کس موضوع پہ مجھے لکھنا چاہیے۔ یہ بھی بتادیں۔“ انداز میں ہلکا سا طنز تھا۔

”اپنے ارد گرد سے انسپریشن ڈھونڈیں۔ آپ کی والدہ ایک زمانے میں چوزے رکھتی تھیں۔“

”اب بھی رکھتی ہیں۔“

”ہاں مگر وہ تمام عرصہ جس میں میں آپ کی زندگی کا حصہ تھی چوزوں کا ایک گروہ ان کے پاس تھا۔ وہ میرے سامنے بڑا ہوا

اور پھر میری ہی وجہ سے وہ کھو گیا۔ آپ کی والدہ کو اس بات کا شدید صدمہ ہوا تھا۔ آپ ان کی زندگی پہ بھی کتاب لکھ سکتے ہیں۔“

”ہمارے چوزے آپ کی وجہ سے کھوئے تھے؟ انٹر سٹنگ۔“ وہ مظلوظ انداز میں مسکرایا۔ ”سوچوں گا۔“

”کسی کام کو کرنے کا بہترین وقت ”ابھی“ ہوتا ہے ایڈم صاحب۔ یہ وقت کے تین سوالوں میں سے ایک کا جواب ہے۔

اگر آپ ابھی فیصلہ کر لیں تو کیا معلوم کوئی معجزہ ہو جائے۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً آپ کو آپ کی کھوئی ہوئی یادداشت واپس مل جائے۔“ وہ پراسرار انداز میں مسکرائی۔

”آپ کی جڑی بوٹیوں والی کہانی اغوا والی کہانی سے بہتر تھی۔“ وہ جھرجھری لے کر پھر سے اپنے فون کو دیکھنے لگا۔ وہ پہلے والی ایڈم جیسا نہیں تھا۔ ہر وقت مصروف.. فون اور کام میں لگا.... بے نیاز سا سلیمیریٹی....

”یشا تاج کی نمائش کب ہے؟ یاد ہے آپ نے مجھے وہاں لے کر جانا تھا۔“

ایڈم کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔ ”اب کیوں؟ آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ آپ کی پی ایم سے ملاقات طے ہو گئی ہے۔“

”تالیہ کے پلانز ہیں۔ تالیہ کی مرضی۔“ اس نے کندھے اچکائے اور اپنا موبائل اٹھالیا۔ ایڈم الجھ کے اسے دیکھنے لگا۔

”میں نے آپ کو اتنا عرصہ ماضی میں برداشت کیسے کیا تھا؟“ وہ جل کے بولا تو وہ مبہم سا مسکرا دی۔ نظریں اسکرین پہ تھیں۔ اور انگلیاں تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔

☆☆=====☆☆

سری پردھانہ کے سب سے بار سوخ دفتر کے بھوری لکڑی سے بنے دروازے کافی اونچے تھے۔ یشا ان کے سامنے کھڑی انہیں گردن اٹھائے مسحوری ہو کے دیکھ رہی تھی جب پیچھے سے پرنسپل سیکرٹری کھٹکھارا۔ وہ چونک کے مڑی۔

”اب آپ اندر جا سکتی ہیں۔ لیکن آپ کے پاس وقت کم ہو گا۔ انہوں نے بہت مشکل سے آپ کے لیے وقت نکالا ہے۔“ وہ انٹرکام کان سے لگائے کہہ رہا تھا۔ ابرو سے آگے جانے کا اشارہ کیا۔ یشا نے کوٹ کی ناویدہ شکنیں درست کیں، بالوں پہ ہاتھ پھیرا اور ہینڈل دبا کے دروازہ دھکیلا۔

فاتح اپنی کرسی پہ براجمان تھا۔ چند فائلز اور لیپ ٹاپ سامنے کھلا رکھا تھا۔ آستین کہنیوں تک موڑے، ٹائی ڈھیلی کیے وہ منتظر سا اس کو دیکھ رہا تھا۔

”آئیے مسز یشا۔“ اس کو آتے دیکھ کے وہ احتراماً کرسی سے اٹھا۔ ”آپ کے ٹیکسٹ نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ آپ اتنی ایمرجنسی میں ملنا چاہتی تھیں۔ خیریت؟ کیا جولیا نہ ٹھیک ہے؟“

”جی وہ ٹھیک ہے۔“ وہ بیٹھ گئی تو فاتح نے انگلیاں باہم پھنسائے آگے کو جھک کے اسے فکر مندی سے دیکھا۔

”پھر؟“

”میں نے جولیا نہ سے آپ کا نمبر یہ کہہ کے مانگا تھا کہ میں ایک ذاتی کام کے سلسلے میں ملنا چاہتی ہوں۔ لیکن دراصل میں جولیا نہ کے لیے ملنا چاہتی ہوں۔ آپ کے پاس میرے لیے کتنا وقت ہے؟“

فاتح نے کسی لحاظ اور مروت کے بغیر کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ ”چھ منٹ۔“

”پھر میں مدے پہ آتی ہوں، تو سری۔“ وہ جی کڑا کے بولی۔ شہدرنگ بال کانوں کے پیچھے اڑے تھے۔ اور سرخ یا قوت سے مزین ٹاپس دکھ رہے تھے۔ ہلکے میک اپ سے مزین چہرہ فکر مند لگتا تھا۔

”جولیانہ نے مجھے بتایا ہے کہ جن کیکس سے مسز عصرہ کی موت واقع ہوئی تھی، ان پہ کسی قسم کی آئسنگ نہیں ہوتی تھی۔ آخری کیک جو پولیس کے ہاتھ لگا تھا اس پہ آئسنگ تھی لیکن جو کیک تالیہ بھیجتی تھی وہ سادہ چاکلیٹ کیک ہوتے تھے۔ جولی نے خود ان کو دو تین دفعہ آتے دیکھا تھا۔ میں شرلاک ہو مز نہیں بننا چاہ رہی، لیکن۔۔۔“ وہ فکر مندی سے کہہ رہی تھی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تالیہ مراد کے بھیجے کیکس زہر سے پاک تھے۔“

فاتح پیچھے کوہو کے بیٹھا اور پتلیاں سکڑے غور سے اسے دیکھے گیا۔

”جولیانہ پہ اس بات کا بہت بوجھ ہے۔ میں صرف یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اگر جولی نے یہ بات آپ کو بتائی تھی تو آپ یہ بات پراسیکیوٹر کو بتا سکتے تھے۔ جولیانہ کا بیان تالیہ مراد کو بری کرنے کے لیے کافی تھا۔ پھر آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ وہ بے گناہ لڑکی اتنے سال پولیس سے چھپتی رہی۔ اس کی تو زندگی برباد ہو گئی۔“

فاتح نے انٹرکام اٹھایا اور بولا۔ ”مجھے دس منٹ مزید لگ جائیں گے۔ میننگ میں شامل افراد سے کہو کہ وہ میرا انتظار کریں۔“ پھر ریسپورر کھا اور اس کو اسی سنجیدگی سے دیکھ کے بولا۔ ”آپ نے vampire disease کا نام سنا ہے مسز میٹھا؟“

وہ اس غیر متوقع سوال پہ ٹکڑ ٹکڑ اس کا چہرہ سننے لگی۔ ”نہیں سر۔“

”یہ بیماری جن لوگوں کو لاحق ہوتی ہے وہ شدید فوٹو سینسٹیو ہوتے ہیں۔ روشنی ان کے لیے خطرناک ہوتی ہے۔ وہ دن میں باہر نہیں نکلتے۔ اندھیروں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ اگر دھوپ یا روشنی ان پہ پڑ جائے تو ان کی جلد جلنے لگتی ہے۔ جیسے غیر مرئی کہانیوں میں ویپائرز ہوا کرتے تھے۔ ایسے ہی کچھ انسان روشنی سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ جولیانہ بھی ان میں سے ایک ہے۔ وہ اندھیروں میں رہنے کی عادی ہے۔ میں اس کو دھوپ میں کیسے کھڑا کر سکتا ہوں۔“

وہ دم سادھے سن رہی تھی۔ اور وہ کہے جا رہا تھا۔

”اس نے مجھے یہ بات قریباً دو سال پہلے بتائی تھی۔ اگر میں اسے پراسیکیوشن کے سامنے لے جاؤں تو رپورٹرز میری بیٹی کا میڈیا ٹرائل کریں گے۔ وہ ایک چودہ سالہ بچی کو گواہی چھپانے کے لیے زور دے گا کہ اس کا نام لیں گے۔ اس کو ملزم ٹھہرائیں گے۔ صرف میں جانتا ہوں کہ جولیانہ عصرہ کی موت کے بعد کتنی مشکل سے زندگی کی طرف لوٹی ہے۔ وہ اینٹی سوشل بلکہ سوسیو پیٹھ بن چکی تھی۔ آپ بھی واقف ہی ہیں اس بات سے کہ وہ ابھی تک کتنی کم اعتماد اور ڈری کھی

لڑکی ہے۔ میں اس کا باپ ہوں۔ مجھے اس کی حفاظت کرنی ہے۔“

”آئی ایم سوری۔ میں نے اس زاویے سے نہیں سوچا تھا۔“

”میں اسے آپ سے زیادہ جانتا ہوں، مسز میٹا۔ وہ اس معاملے کو نہیں ہینڈل کر سکے گی۔ اور اس کی گواہی تالیہ کو بری نہیں

کر داسکتی کیونکہ جو ایک پولیس کے ہاتھ لگا تھا اس میں آر سینک تھا۔ اور وہ تالیہ کے نام سے ہی بھیجا گیا تھا۔“

”آپ کی ساری باتیں درست ہیں۔ لیکن تالیہ مراد کا کیا؟ وہ بے چاری تو بے قصور تھی۔“ وہ دکھ سے کہہ رہی تھی۔

”آپ تالیہ کو نہیں جانتیں۔ میں جانتا ہوں۔ تالیہ اپنا خیال خود رکھ سکتی ہے۔ اس نے یہ جرم نہیں کیا تھا۔ میں نے تب بھی

اس سے کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ اس میس سے نکل آئے گی۔ وہ تالیہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کر لے گی۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی فوراً سے اٹھی۔

”آپ کا دوسرا کام کیا تھا؟“

”وہ.... کچھ نہیں۔ میرا ایکس ہر ہینڈ....“ اس نے سر جھٹکا۔

”میرے پی ایس کے پاس ایک تحریری درخواست چھوڑ جائیں۔ وہ آپ کا مسئلہ حل کروادے گا۔“ اس نے کوٹ پہنتے

ہوئے تاکید کی تو میٹا نے سرنگی میں ہلایا۔

”نہیں سر۔ مجھے شکایت نہیں کرنی۔ وہ میری بیٹی کا باپ ہے اور میں اپنی بیٹی کو ہرٹ نہیں کر سکتی۔ آپ یہ بات مجھ سے بہتر

سمجھ سکتے ہیں۔ میں نمائش پہ آپ کا انتظار کروں گی۔“ پھر سر جھٹکا کے تعظیم پیش کی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے

باہر نکلتے ہی تین چار افراد اندر آ گئے۔ میٹا نے مڑ کے دیکھا۔ اب وہ ان افراد سے بات کرتا ہوا باہر آ رہا تھا۔ اس آدمی کے پاس ضائع کرنے کے لیے ایک منٹ بھی نہیں تھا۔

☆☆=====☆☆

سرما کی دھوپ سارے بازار پہ پھیلی تھی۔ صاف تھری سی سڑک کے دونوں اطراف دکانوں کی قطاریں تھیں اور ان کے

آگے چھجے ڈال کے کرسیاں میزیں بچھائی گئی تھیں۔ فرانسیسی طرز کا یہ بازار مختلف رنگوں کے پھولوں سے مزین تھا۔

وہ ٹیکسی سے اتری اور سن گلاسز ماتھے کے اوپر چڑھائے۔ سیاہ شیشے آنکھوں کے سامنے سے بڑے تو بازار کے خوشنما پھولوں

کے قدرتی رنگ دکھائی دینے لگے۔ فضا اتنی معطر تھی کہ تالیہ کے اندر تک تازگی اترتی گئی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس اندر کھینچی۔ پھر احساس ہوا کہ کوئی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں

کھولیں تو دیکھا وہ ایڈم تھا۔

سفید شرٹ پہ سیاہ کوٹ پہنے وہ سن گلاسز لگائے ہوئے تھا۔ اسے دیکھ کے گلاسز اتاریں اور اور کلائی پہ بندھی گھڑی اسے دکھائی۔ ”آپ مقررہ وقت سے پندرہ منٹ لیٹ ہیں، کس مراد۔“

”تو کیا ہوا؟ وقت مجھ پہ ویسے ہی مہربان ہے۔“ وہ مسکرا کے کہتی آگے بڑھ گئی۔ اس نے سرخ و سفید پھولدار لمبی فرائیڈ پہن رکھی تھی۔ کندھے سے سنہری چین والا پرس لٹک رہا تھا اور سر پہ سفید ہیٹ ترچھا کر کے رکھا تھا۔ وہ پھولوں کے بازار میں کسی سرخ سفید پھول کی مانند دکھ رہی تھی۔

”تو میرا کریڈٹ کارڈ یہاں سے استعمال کیا گیا تھا؟“ دونوں اسٹریٹ کے کنارے ساتھ ساتھ چلنے لگے تو تالیہ نے پوچھا۔

”میرے انویسٹی کیئر نے اس پر کسی سرور کو ان ماسک کر لیا ہے۔ آپ کا کارڈ مجھے جگہوں سے استعمال کیا گیا تھا۔ میں پانچ جگہوں کا دورہ کر چکا ہوں۔ سوائے اس آخری جگہ کے۔“ وہ چلتے ہوئے بتا رہا تھا۔

”وہ جو بھی تھا، کسی کافی شاپ میں بیٹھ کے آپ کے کارڈ کے ذریعے ایک آرڈر کرتا تھا۔ دو جگہوں پہ کافی شاپس آج بھی موجود تھیں۔ تین جگہوں پہ کسی زمانے میں کافی شاپس ہوا کرتی تھیں۔ اب وہاں کوئی اور دکان تھی یا کوئی ریسٹوران۔ مختصر یہ کہ کسی کے پاس چھ سال پرانے سی سی ٹی وی ریکارڈز نہیں تھے۔ نہ مجھے کوئی ایسا شخص ملا جو چھ سال سے وہاں کام کر رہا ہو۔“

”یعنی ہمارے ہاتھ کوئی سرا نہیں آیا؟“

”نہیں۔ آخری جگہ ٹرائی کر لیتے ہیں۔ سامنے والی ان شاپس میں سے کوئی ایک شاپ ہے جہاں ہمیں جانا ہے۔“

وہاں ایک کافی شاپ وسط میں نظر آرہی تھی۔ ان کے قدم اسی جانب اٹھنے لگے۔

”کیا کوئی ایسی چیز ہے جو ان شاپس میں مشترک ہو؟“

”نہیں۔ تمام شاپس مختلف ناموں اور برانڈز کی تھیں۔“ وہ قدرے مایوس لگتا تھا۔ پھر چہرہ موڑ کے اسے دیکھا اور پوچھنے لگا۔ ”عصرہ کے فون اور بینک ریکارڈز نکلوائے تھے احمد نظام صاحب نے۔ ان کا کیا بنا؟“

”ایک بھی پے منٹ مشکوک نہیں ہے۔ نہ عصرہ نے ان سات دنوں میں کوئی بھاری رقم نکلوائی، نہ رقم کسی کو بھیجی۔ بلکہ ان دنوں میں عصرہ نے کوئی خاص شاؤنگ بھی نہیں کی۔“

ایڈم رکا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر سنجیدگی سے پوچھا۔ ”اگر اس آخری شاپ سے بھی کوئی سراغ نہ ملا... تو؟“

”کچھ تو ملے گا۔ عام طور پر آخری چابی سے ہی کھلتے ہیں۔“ وہ زور دے کر بولی اور آگے بڑھ گئی۔

”کیا یہ شاپ چھ سال پہلے یہاں موجود تھی؟“

کچھ دیر بعد وہ دونوں کافی شاپ کے کاؤنٹر پہ کھڑے پوچھ رہے تھے۔ ریسپشنسٹ جواب میں ان کو بتانے لگا کہ یہ شاپ گو کہ یہاں موجود تھی لیکن اس دوران دو دفعہ اس کی ملکیت بدلی ہے۔ ملکیت کے ساتھ عملہ بھی بدلہ ہے۔ وہ قریباً ڈیڑھ برس سے کام کر رہا ہے یہاں اور پچھلے عملے کے بارے میں اسے کوئی معلومات نہیں ہیں۔

تالیہ تنکھیوں سے دیکھ سکتی تھی کہ ارد گرد ویزز میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ وہ ان دونوں کو دیکھتے ہوئے دھیمی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ چھ سال گزر گئے اور دنیا نہیں بدلی۔ آج بھی سلیپر میز کو دیکھ کے لوگوں میں خوشی اور جوش کی لہر دوڑ جانا لازم تھا۔

”یہ میرا کارڈ رکھ لیں۔ کچھ بھی یاد آئے تو مجھے کال کر لیجیے گا۔“ ایڈم نے آخر میں اپنا کارڈ اسے تھمایا اور تالیہ کو دیکھ کے کندھے اچکائے۔ وہ قدرے خاموش اور اداس لگتی تھی۔

وہ دونوں باہر آئے اور سڑک کنارے بیٹھی کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔ ایڈم نے ویٹر کو اشارہ کر کے ایک چائے لانے کو کہا اور پھر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”کم از کم آپ یہ تو ثابت کر سکتی ہیں کہ یہ آرڈر ملا میثیاء سے کیا گیا جبکہ آپ مصر میں تھیں۔“

”آپ کے خیال میں مجھے اپنی بے گناہی صرف کورٹ میں ثابت کرنی ہے؟“ وہ نظریں اس پہ مرکوز کیے ایک دم تلخی سے بولی۔ ”مجھے ٹھوس ثبوت چاہیے ہیں۔ یہاں سب مجھے مجرم سمجھتے ہیں۔ مجھے لوگوں کی نظروں میں بری ہونا ہے۔ قانون کی فائلوں میں نہیں۔“

اس نے بازو سینے پہ لپیٹ لیے اور زور سے انداز میں سڑک کو دیکھنے لگی۔ ”مجھے پورا یقین تھا کہ آخری شاپ سے کچھ نہ کچھ ملے گا۔“

”کیا عصرہ کی کوئی بیسٹ فرینڈ تھی؟ یا کوئی ایسا دوست جس سے وہ سب شیئر کرتی ہو؟“ وہ سوچ سوچ کے کہہ رہا تھا۔

”معلوم کیا جاسکتا ہے۔ ویسے مجھے خوشی ہے کہ آپ میرے لیے بہت وقت نکال رہے ہیں۔“ وہ اسے دیکھ کے اداسی سے مسکرائی۔

”اس کی دو جوہات ہیں۔ آپ کی وجہ سے میں ایک پوٹینشل بیسٹ سیلر لکھنے جا رہا ہوں۔ اور آپ میری زندگی کے کھوئے چھ ماہ کی کہانی جانتی ہیں۔ میں آپ کی مدد کروں گا تو آپ میری مدد کریں گی۔“ وہ اسی اجنبی انداز میں مسکرا کے بولا۔ پھر گھڑی دیکھی۔

”شام کو نمائش پہ جانا ہے۔ میں آپ کو پک کر لوں گا۔ ابھی مجھے کچھ کام ہے۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ تالیہ نے نظریں اٹھا

کے مسکرا کے اسے دیکھا۔

”آپ فلکشن نہ لکھیں۔ بلکہ کوئی بھی فیصلہ وقت پہ نہ کریں۔“

”ایں؟ وہ کیوں؟“ وہ تعجب سے اسے دیکھ کے بولا۔

”کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ آپ کی کھوئی ہوئی یادداشت واپس آئے۔ کچھ چیزوں کا بھول جانا ہی اچھا ہوتا ہے۔ میں خوش

ہوں ایڈم کہ آپ وہ سب بھول گئے۔ اس لیے... وقت کے سوالوں کو حل کرنے کی کوشش نہ کریں۔“

ایڈم نے سرکواشبات میں خم دیا۔ ”جڑی بوٹیاں واٹ ایور۔“ اور کچھ بڑبڑا کے آگے بڑھ گیا۔ وہ پھولوں سے بھرے بازار

میں تنہا بیٹھی چائے کا انتظار کرنے لگی۔

اسے آج وان فاتح سے ملنے وہیں جانا تھا جہاں برسوں پہلے ”بطور تالیہ مراد“ وہ اس سے پہلی دفعہ ملی تھی۔

☆☆=====☆☆

آرٹ گیلری کی سفید مرمریں دیواروں پہ دور دور تک فریمز آویزاں نظر آرہے تھے۔ چکنے فرش پہ مہمان ٹولیوں کی صورت

بکھرے تھے۔ لوگ بہت زیادہ نہیں تھے۔ میٹا نے اسے محدود اور پرائیوٹ سارکھا تھا۔ جولیانہ کی خواہش پہ اس نے اس

نمائش کو عصرہ کی پرانی گیلری میں منعقد کیا تھا۔

خود وہ لمبی میکسی میں ملبوس تھی جو سامنے سے سنہری اور پشت سے گہری نیلی تھی گیلری کی سجاوٹ بھی انہی دو رنگوں کے

استراج میں کی گئی تھی۔ میٹا کے شہدرنگ بالوں کے ساتھ نیلے نگینوں والے ناپس بھی گویا سجاوٹ کا حصہ لگتے تھے۔ وہ مسکرا

مسکرا کے تمام مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ ابھی پردھان منتری کی آمد نہیں ہوئی تھی۔ وہ کچھ دوستوں کو اپنی ایک

فوٹو گراف کے بارے میں مسکرا کے کچھ بتا رہی تھی جب اس کی نظر پیچھے ایک نووارد پہ پڑی۔

میٹا کی آنکھوں میں خوشگوار حیرت درآئی۔ وہ معذرت کر کے فوراً اس طرف آئی۔

”ایڈم بن محمد؟ واٹ اے سر پرائز۔“

ایڈم جو تنہا کھڑا ایک فریم کو دیکھ رہا تھا، آواز پہ اس کی طرف پلٹا اور مسکرایا۔ وہ سفید شرٹ پہ سیاہ ڈنر جیکٹ پہنے ہمیشہ کی

طرح تازہ دم اور خوش باش لگ رہا تھا۔

”ایک دوست نے آپ کی پارٹی کا دعوت نامہ دیا تھا۔ سوچا چکر لگا لوں۔ شاید کوئی اسپاریشن مل جائے۔“ وہ سادگی سے

کندھے اچکا کے بولا۔

”مجھے بہت خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کے۔ میں نے آپ کی تمام کتابیں پڑھ رکھی ہیں اور کوشش کرتی ہوں کہ آپ کا شو بھی

باقاعدگی سے دیکھا کروں۔ مجھے معلوم ہوتا آپ آرہے ہیں تو میں آپ کی بک لے آتی آنوگراف کے لیے۔“ وہ اسے دیکھ کے جیسے بہت خوش ہوئی تھی۔

”ارے نہیں۔ یہ آپ کی پارٹی ہے۔ آج کی سلیمیریٹی آپ ہیں۔“ ایڈم نے مصنوعی عاجزی سے سر کو خم دیا۔

”اچھا آپ آگے آئیں نا۔ میں آپ کو اپنا کام دکھاتی ہوں۔“

”میں دراصل اپنی پلس ون کا انتظار کر رہا ہوں جو ابھی تک نہیں پہنچیں۔“ اس نے کہنے کے ساتھ متلاشی نظروں سے داخلی گزرگاہ کو دیکھا۔ بیشا مسکرا کے آگے بڑھنے لگی تو وہ جلدی سے بولا۔

”مسز بیشا... کیا ہم پہلے مل چکے ہیں؟“

”میں اور آپ؟“ وہ ٹھہر کے اسے دیکھنے لگی۔ ”نہیں تو۔“

”آر یوشیور؟ کیونکہ میری ایک دفعہ کچھ مہینوں کے لیے یادداشت کھو گئی تھی۔ ۲۰۱۶ کی بات ہے۔ کیا ہم کبھی اس دوران ملے تھے؟“

”نہیں۔ ۲۰۱۶ میں تو میں امریکہ میں ہوتی تھی۔ اور اگر میں آپ سے ملی ہوتی تو مجھے ضرور یاد ہوتا۔ سلیمیریٹی سے ملاقات کی تمام جزئیات انسان کو یاد ہوتی ہیں۔“

”اور تالیہ مراد... آپ ان سے ملی ہیں کبھی؟“

”تالیہ مراد؟ نہیں۔“ اس نے الجھن سے دائیں بائیں گردن ہلائی۔ پھر ایڈم کے پیچھے کسی کو دیکھ کے آنکھیں تعجب سے پھیلیں۔ ”اوہ۔ تالیہ مراد آپ کی پلس ون ہیں۔“

ایڈم مڑا تو دیکھا وہ سامنے سے چلی آرہی تھی۔ اس نے سادہ سیاہ میکسی پہن رکھی تھی جو پاؤں کو چھوتی تھی۔ بال جوڑے میں بندھے تھے اور کانوں سے سرخ موتی لٹک رہے تھے۔ ہاتھ میں سرخ کلچ تھا۔ ایڈم کو دیکھ کے وہ مسکرائی اور اس طرف چلی آئی۔

”تالیہ مراد... بیشا نے امروا چکا کے گہری سانس لی۔ ”خوشی ہوئی آپ کو دیکھ کے۔“

تالیہ ایڈم کے قریب آئی۔ اسے سلام کیا۔ تاخیر کے لیے معذرت کی۔ پھر بیشا کو دیکھا تو لاعلمی سے ایڈم کو اشارہ کیا جیسے کہہ رہی ہو یہ کون ہے؟ ایڈم اس انداز پر گڑبڑا گیا۔

”یہ وہ آرٹسٹ جن کی نمائش پہ ہم اس وقت کھڑے ہیں۔“

تالیہ نے لاعلمی سے معذرت کرتے ہوئے کندھے اچکائے۔

”سوری میں آپ سے واقف نہیں تھی۔ اس شہر سے عرصہ دراز سے لاتعلق رہی ہوں سوئے آرٹسٹس کے بارے میں کوئی خبر نہیں۔ میں آپ کا کام ضرور دیکھوں گی۔“

میشا مسکرا کے اس کا شکر یہ ادا کرتی آگے بڑھ گئی۔ تالیہ اسے دور جاتے دیکھتی رہی۔ پھر چہرہ موڑا تو دیکھا ایڈم اسے پتلیاں سکوڑے گھور رہا تھا۔

”نہ وہ آپ کو جانتی ہے نہ آپ اسے۔ تو آپ نے مجھے کیوں کہا کہ آپ اسے جانتی ہیں؟“

”اور آپ نے میرا یقین کر لیا؟ یاد رہے... میں کون دو من ہوں۔“ وہ مسکرا کے گردن موڑ موڑ کے اطراف میں دیکھنے لگی۔ ایڈم نے اچھنبے سے اسے دیکھا۔

”میں آپ کو سمجھ نہیں پا رہا۔“

”گڈ۔ اب آپ کی کہانی مزید دلچسپ ہو جائے گی۔“ وہ گردن موڑ کے ایک فوٹو فریم کو دیکھ رہی تھی۔ اس میں ایک خوبصورت سیاہ گھوڑا گھاس چرتا نظر آ رہا تھا۔

”یعنی آپ اس کو نہیں جانتی تھیں۔ آپ نے یہ صرف اس لیے کہا تا کہ میں آپ کو پارٹی میں ساتھ لے جاؤں۔ میں ویسے بھی لے جاتا۔ آپ کو یہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔“

تبھی محفل میں نامحسوس سی ہلچل مچی۔ کچھ لوگ سر جوڑے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہنے لگے۔ تبھی سوٹ والے افراد اندر آئے اور ارد گرد بکھر گئے۔ وہ مختلف آلوں کی بد سے گیلری کو سوپ کر رہے تھے۔ چند لمحے گزرے جب انہوں نے وائرلیس پہ باہر والوں کو کلیئر کی خبر دی۔ ہلچل بڑھ گئی۔ لوگ دروازے سے راستہ چھوڑ کے کھڑے ہو گئے۔

”پتہ ہے میں یہاں کیوں آنا چاہتی تھی؟“ وہ دونوں ہجوم سے ہٹ کے ایک دیوار کے ساتھ کھڑے دروازے کو دیکھ رہے تھے۔

”کیونکہ یہ وہ جگہ ہے جہاں ہم پہلی بار ملے تھے۔“

”ہم؟“

”میں تم‘ فاتح اور عصرہ۔“ وہ دروازے سے داخل ہوتے فاتح کو دیکھ کے بولی۔ وہ حسب معمول لوگوں میں گھرا مسکرا کے اندر آ رہا تھا۔ اشعر اور جولیانہ اس کے ہمراہ تھے۔ میشا ان کو خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ اسے جولیانہ کے آنے کی بہت خوشی تھی۔

”اسی گیلری میں؟“

”ہاں۔ یہ عصرہ کی گیلری ہوا کرتی تھی۔ گو کہ اس سے دو تین دن پہلے بھی ہم ملے تھے۔ میں تم‘ فاتح اور عصرہ۔ تنگو کامل

کے گھر لیکن تب تم لوگ ایک نوکرائی سے مل رہے تھے۔ اصل تالیہ مراد سے نہیں۔ یعنی کہ سوشلائٹ تالیہ سے نہیں۔ ہماری اصل ملاقات اس گیلری میں ہوئی تھی۔“

”اسی لیے آپ یہاں آنا چاہتی تھیں۔ آپ وان فاتح سے اسی جگہ ملنا چاہتی تھیں جہاں آپ پہلی دفعہ ان سے ملی تھیں۔“

“How poetic.

”اب تم تالیہ مراد کو سمجھنے لگے ہو۔“

”امید ہے کہ آپ کی کہانی اس سے زیادہ دلچسپ ثابت ہوگی اور میرا یہ سارا وقت ضائع نہیں جائے گا۔“ وہ پور نظر آتا تھا۔

تالیہ نے پلٹ کے غور سے اسے دیکھا۔ ”میں آپ کا وقت ضائع نہیں کر رہی ایڈم۔ یا شاید آپ نے ابھی تک میرے

خلاف دل سے بغض نہیں نکالا۔“

وہ چونکا۔ ”مجھے آپ سے کس چیز کا بغض ہو سکتا ہے؟“

”میری وجہ سے کچھ کھویا تھا آپ نے.....“

”کیا؟“

اس نے ایڈم کی آنکھوں میں دیکھ کے وقفہ دیا۔ ”آپ کے چوزے..... وہ میری وجہ سے کھوئے تھے نا۔“

ایڈم ہلکا سا ہنس دیا اور گردن موڑ کے اس طرف دیکھنے لگا جہاں فاتح رہن کاٹ رہا تھا۔ کیمرے کی فلیش کی چکاچوند میں

وہ مسکراتے ہوئے اب پیشا کی فوٹو گرافی پہ تبصرہ بھی کر رہا تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے اس طرف دیکھتے رہے۔

”آپ کی جراثیمات پہ حیرت ہے۔“ آواز پہ وہ دونوں اپنی ایڑیوں پہ گھومے تو دیکھا۔ سامنے اشعر کھڑا تھا۔ گلاس اٹھائے

طنزیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ زہر خند ہوا۔ ”میرا خیال تھا آپ شرمندگی سے اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نہیں نکل پائیں

گی۔“

”کیا آپ کو ابھی تک سمجھ نہیں آیا کہ تالیہ کی ہمت کوئی نہیں توڑ سکتا؟“ سیاہ لباس والی لڑکی مسکرائی تو اس کی آنکھوں میں

چمک در آئی۔ اشعر نے تحقیر سے اسے دیکھا اور سرگوشی میں بولا۔

”تم میری بہن کی قاتل ہو۔ میں اپنی بہن کا انتقام ضرور لوں گا۔“

”وہ بہن جس کو بدنام کرنے کے لیے جعلی گھائل غزال بھیجی تھی آپ نے اسے؟“

”آہم۔“ ایڈم کھٹکھٹا ہوا۔ ”آپ دونوں ایک ٹرائل میں گواہی دینے جا رہے ہیں۔ آپ کو آپس میں بات نہیں کرنی

چاہیے۔“

”کیا اب میں اشعر صاحب کا حال تک نہیں پوچھ سکتی؟“ وہ ابرو اچکا کے مسکرائی۔ ”آپ کا بازو کیسا ہے۔“

”ویری فٹی۔“ اشعر نے تنفر سے سر جھٹکا اور آگے بڑھ گیا۔ مشروب کا آخری گھونٹ بھر کے اس نے گلاس پرے رکھا۔ ایک نظر دور مہمانوں میں گھرے فاتح اور یثا کو دیکھا۔ پھر اپنے پی ایس کو اشارے سے بلایا۔

”احمد نظام.... تالیہ مراد کا وکیل.... اس سے میری بات کرواؤ۔ اس روز ہماری بات ادھوری رہ گئی تھی۔“ وہ زیر لب مسکرا کے بولا۔ ماورائے عدالت ساز باز میں اپنا ہی لطف تھا۔

کچھ دیر بعد پی ایس اس کے پاس آیا۔ ”سر.... میں نے ان سے بات کی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں انہوں نے آپ کو فون نہیں کیا تھا۔“

اشعر محمود ایک لمبے کے لیے ساکت ہو گیا۔ نظریں آہستہ سے تالیہ کی طرف موڑیں۔ وہ دور ایڈم کے ساتھ کھڑی اس سے کچھ کہہ رہی تھی۔ سیاہ لباس اور سرخ انیر رنگز والی لڑکی بالکل مطمئن اور پرسکون نظر آتی تھی۔

(آپ کا بازو کیسا ہے؟) اشعر تیزی سے مڑا اور ریٹ روم کی طرف بڑھ گیا۔ ایک باتھ روم کے اندر آ کے اس نے دروازہ بند کیا اور کوٹ اتار کے اسٹینڈ پہ لٹکایا۔ پھر تیزی سے بائیں آستین اوپر چڑھائی۔

بازو پہ سرخ سا نشان نظر آ رہا تھا جو دو تین دن سے اسے بار بار کھجانے پہ مجبور کر دیتا تھا۔ جیسے کسی نے بے احتیاطی سے سرنج اندر گھسائی ہو۔

اس نے چہرہ اٹھا کے آئینے میں خود کو دیکھا۔ اس کی رنگت سفید پڑ رہی تھی۔ پھر اس نے موبائل نکالا اور وہ ویڈیو کھولی جو اسے ایک پولیس آفیسر نے بھیجی تھی۔ انیر وگیشن روم میں زخمی چہرے والی تالیہ بیٹھی خوف سے کہہ رہی تھی۔

”اغوا کار.... میں نے ان کی شکل نہیں دیکھی.... انہوں نے ماسک پہن رکھے تھے....“

یہ وہ تالیہ نہیں تھی جو ابھی باہر گیلری میں کھڑی تھی۔ وہ زخمی چہرہ وہ اندھیرے سے روشنی میں آنے کا خوف.... وہ سب اداکاری تھا۔ وہ اغوا والی کہانی، کہانی نہیں تھی۔ وہ اسے حقیقت بنا چکی تھی۔

وہ اس روز فاتح سے ملنے نہیں آئی تھی۔ وہ اشعر سے ملنے آئی تھی۔ سگنلز اسی نے خراب کیے تھے۔ کال اسی نے کروائی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ اس کے پیچھے آئے گا۔ اس نے جان بوجھ کے اسے بے ہوش کیا تھا۔ تاکہ وہ اس کے اندر کوئی سرنج داخل کر سکے۔ لیکن تالیہ اس کو کس چیز کا انجیکشن لگائے گی؟

اس نے الجھ کے بازو کے نشان کو دیکھا۔ باقی ہر شے سمجھ آتی تھی۔ وہ گرفتار ہونے آئی تھی۔ اس نے جان بوجھ کے اشعر سے ہاتھ پائی کی تھی تاکہ وہ پولیس کو زخمی حالت میں ملے اور اس کی اغوا والی کہانی ٹھوس لگے۔ لیکن اغوا والی کہانی تو تب ثابت

ہوگی جب پولیس کو وہ کنٹینر ملتا اور....

اشعر نے چونک کے بازو کے نشان کو دیکھا۔ تالیہ نے اسے انجیکشن نہیں لگایا تھا۔ اس نے اشعر کا خون نکالا تھا۔ اس کے پاس ایک بیگ تھا۔ گرفتاری کے وقت اس کے پاس سے کوئی بیگ نہیں ملا تھا۔ اس نے راستے میں ایک ٹیکسی بدلی تھی۔ وہ ٹیکسی دھینا اس کے کسی سہولت کار کی تھی۔ اس نے بیگ اس کی کار میں چھوڑ دیا ہوگا۔ اور اس بیگ میں کیا ہوگا؟ اس نے کرب سے آنکھیں میچیں۔ اشعر کے فنگر پرٹس اور خون لگی چیزیں۔ اور دھینا بہت جلد پولیس کو ایسا کنٹینر مل جائے گا جس میں وہ چیزیں موجود ہوں گی۔

☆☆=====☆☆

پولیش کمشنر اپنے آفس میں بیٹھا فائلز دیکھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ چائے کے گگ سے گھونٹ بھر رہا تھا جب دروازہ کھٹکھٹا کے اس کا ماتحت اندر داخل ہوا۔ کمشنر نے چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔

”پھر؟“

ماتحت نے آستینیں جڑھا رکھی تھیں اور ٹشو سے پیشانی کا پسینہ صاف کر رہا تھا۔

”آپ یقین نہیں کریں گے۔“

”میں کر لوں گا۔ تالیہ مراد سچ کہہ رہی تھی نا؟“ وہ سانس روکے اس کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کرسی کھینچ کے بیٹھا اور آگے کو جھکے پر جوش آواز میں بتانے لگا۔

”وہ سب سچ کہہ رہی تھی۔ اس کو واقعی اغوا کیا گیا تھا۔ آپ نے دیکھا وہ روشنی سے اسی لیے خوفزدہ تھی کیونکہ اسے ایک لمبا عرصہ اندھیرے میں رکھا گیا تھا۔ میری ٹیم کو وہ کنٹینر مل گیا ہے اور اس کے ویکل کا نمبر ۸۶۷۷ ہے۔ وہ آدھا سرخ ہے اور آدھا نیلا۔“

کمشنر نے فائل بند کی اور مسکرا کے آگے ہوا۔ ”لیکن اگر یہ صرف ایک اتفاق ہوا؟“

”اونہوں۔ آگے تو سنیں۔ کنٹینر کے اندر خون کی دھاریں ہیں۔ جیسے کوئی زخمی حالت میں وہاں سے نکلا ہے۔ خون آلود پیر بھی ہیں۔ ٹوٹی ہوئی جھکڑی خون آلود سی چند بال اور بہت سے فنگر پرٹس ہمیں ملے ہیں۔ وہاں دھینا کسی کو اغوا کر کے رکھا گیا تھا۔“

”اوکے۔ تمام سیمپلو ایب بھجوا دو اور جیسے ہی ٹیسٹ رپورٹس آئیں مجھے اطلاع کرو۔ فرانزک سے کہو کہ اس کنٹینر کا اچھی طرح جائزہ لے۔ یہ کیس بہت دلچسپ ہو چکا ہے۔“

”آئی نوٹس۔“ وہ جوش سے کہتا اٹھ کھڑا ہوا۔ کمشنر نے پیچھے کوٹیک لگائی اور جھرجھری لی۔
(یعنی وہ لڑکی سچ کہہ رہی تھی؟ بہت دلچسپ۔)

☆☆=====☆☆

آرٹ گیلری میں مہمان اب ٹولیوں کی صورت آگے پیچھے فوٹو فریمز کا جائزہ لیتے نظر آرہے تھے۔ پس منظر میں دھیمے سروں میں موسیقی بج رہی تھی۔ ڈرنکس اور سوئیٹنس سرو کی جارہی تھیں۔ ایک ویٹر تالیہ اور ایڈم کے قریب ٹرے لے کر آیا تو ایڈم نے سویٹ کا ایک ٹکڑا اٹھالیا۔ تالیہ نے مسکرا کے سرنگی میں ہلا دیا۔ وہ آگے بڑھ گیا۔
اشعر تیز قدموں سے ان کے قریب آیا تو تالیہ نے مصنوعی حیرت سے اس کا غصیلا چہرہ دیکھا۔
”آپ کو کیا ہوا؟“

”تم مجھے اپنے اغوا کے جرم میں فریم کر رہی ہو ہاں؟“ وہ سرگوشی میں غرایا۔ ”تم اس دن جان بوجھ کے گرفتار ہوئی تھیں۔ تم نے میرے فنگر پرنٹس لیے۔ میرا خون لیا۔ میرا ڈی این اے اب تم کسی کنٹینر پہ ڈال کے مجھے پھنسانا چاہ رہی ہو؟“
”اوہ واؤ۔“ ایڈم نے لب گول کیے چونک کے تالیہ کو دیکھا۔ اس نے مسکرا کے کندھے اچکا دیے۔

”مجھے نہیں پتہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، اشعر صاحب۔“
”جلد ہی پولیس کو کوئی ایسا مشکوک کنٹینر مل جائے گا میں جانتا ہوں۔“ وہ چبا چبا کے بولا۔ ”لیکن یا درکھنا اس طرح کی فریم جابز کامیاب نہیں ہوتیں۔“
”میں نے کہا نا مجھے نہیں معلوم آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“
”تالیہ!“

شنا سا آواز پہ اسے لگا وہ سانس لینا بھول گئی ہے۔ وہ چونک کے مڑی۔ وان فاتح سامنے سے چلا آرہا تھا۔ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی۔ تعجب تھا۔ خوشی تھی۔ پیچھے دو گارڈز بھی تھے۔ اشعر تن فن کرتا وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ اب اشعر کی طرف متوجہ بھی نہیں تھی۔

فاتح اس کے عین سامنے آکھڑا ہوا۔ وہ دم سادھے اسے دیکھے گئی۔
”تالیہ.... کیسی ہو؟“ وہ نرم مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔ چھ سال.... یا چھ دن.... درمیان سے وقت کے سارے حساب کتاب غائب ہو گئے تھے۔
اس کے لب ہلکی سی مسکراہٹ میں ڈھلے۔

”اچھی ہوں۔ وقت میرے ساتھ بہت مہربان رہا ہے۔ اور آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں، تالیہ۔ میں بہت سوں سے بہتر ہوں۔“ مسکرا کے ہلکے سے شانے اچکائے۔ وہ اس سے نظریں نہیں ہٹایا رہا تھا۔ اور ان نظروں میں اپنا بیت تھی، محبت تھی، مسکراہٹ تھی۔ وہاں کوئی گلہ، کوئی سوال، کچھ نہ تھا۔ ایڈم گلاس سے گھونٹ بھرتا وہاں سے ہٹ گیا۔ لوگ مڑ مڑ کے ان کو دیکھنے لگے۔ گارڈز فاتح کے پیچھے آکھڑے ہوئے اور کسی کو بھی اس طرف آنے سے روکنے لگے۔

ایک دفعہ پھر بھری محفل میں وہ تنہا تھے۔

”لانگ ٹائم۔“ وہ اس کو دیکھ کے مسکرا کے کہہ رہا تھا۔

”اچھا؟ میرے لیے جیسے کل کی ہی بات تھی۔“ وہ زخمی سا ہنسی۔ سفید دیواروں پہ لگے سارے سیاہ گھوڑے اپنی گہری آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھنے لگے۔ ارد گرد کی تمام آوازیں بند ہو چکی تھیں۔

”تمہیں یاد ہے یہ وہ جگہ ہے جہاں ہم پہلی دفعہ ملے تھے۔ ہم سب۔“

”آپ کو بھی یاد ہے؟“ اسے حیرت ہوئی۔ کبھی اس کے بھولنے پہ حیرت ہوتی تھی۔ آج اس کے یاد رہ جانے پہ حیرت ہوئی تھی۔

”ہوں۔ مجھے نہیں معلوم تھا تم یہاں آئی ہو گی۔ اب میرے جانے کا وقت ہے۔“ فاتح نے کلائی کی گھڑی دیکھی اور پھر اسی بٹاشیت سے تالیہ کو دیکھا۔ ”میں کل صبح تمہارا انتظار کروں گا۔ تم آرہی ہونا؟“

اس شخص کو کون انکار کر سکتا تھا۔ تالیہ نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جیسے آیا تھا ویسے ہی پلٹ گیا۔ اس کی خوشبو اور مقناطیسیت کا ہالہ اس کے ساتھ ہی دور ہوتا گیا۔

فسوں ٹوٹا تو تالیہ نے چونک کے ادھر ادھر دیکھا۔ ایڈم قریب ہی کھڑا تھا۔ مسکرا کے قریب آیا اور سرگوشی میں بولا۔

”آپ کی پی ایم سے باتیں کرنے کی تصاویر جو ایک گھنٹے کے اندر اندر سوشل میڈیا پہ آنے والی ہیں یا تو آپ کا کیس خراب کریں گی یا.....“

”اٹس اوکے ایڈم۔“ وہ مسکرا دی۔ ”تالیہ اب کسی چیز سے نہیں ڈرتی۔“ اور کندھے اچکا دیے۔ دور کھڑا شعرا بھی تک ان دونوں کو گھور رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

نمائش کے اختتام کے تین گھنٹے بعد..... کوالا پور کے ایک پوش علاقے میں بنے بنگلے کے باہر پولیس کی تین گاڑیاں کھڑی

تھیں۔ بنگلے کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے نظر آرہے تھے اور دیواروں پہ سرخ پینٹ سے نازیبا کلمات لکھے دکھائی دے رہے تھے۔ یوں لگتا تھا کسی نے بنگلے پہ بری طرح حملہ کیا تھا۔ کہیں کہیں گولیوں کے راؤنڈز اور شیل بھی بکھرے تھے۔ پولیس اہلکار ہرجگہ بکھرے ان چیزوں کو اکٹھا کر رہے تھے اور متاثرہ حصوں کی تصاویر لے رہے تھے۔

اندر لاؤنج میں توڑ پھوڑ کے آثار واضح نظر آتے تھے۔ فرنیچر ادھر ادھر بکھرا تھا۔ ڈیکوریشن پیسز ٹوٹے پڑے تھے۔ پینٹنگز پھٹی ہوئی نیچے پھینکی گئی تھیں۔

بڑے صوفے پہ ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکی میشا سے لگ کے بیٹھی تھی۔ میشا شال لپیٹے سرخ ٹاک اور گیلی آنکھوں سے سامنے بیٹھے تفتیشی افسر کو بتا رہی تھی۔

”میں نمائش سے گھر آئی تو سب کچھ اسی طرح پڑا تھا۔ میری پینٹنگز بھی پھاڑ دیں اس نے۔ میرے کمرے کے لا کر سے کیش بھی غائب ہے۔“ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی اور وہ خود کو کمپوز رکھنے کی کوشش میں بری طرح ناکام نظر آتی تھی۔ سارا مسکرا رہا تھا۔ جیولری تک اتارنے کا وقت نہیں ملا تھا۔

”مسز میشا.... آپ کو کس پہ شک ہے؟“

اس نے گیلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ”پتہ نہیں۔“ اور نظریں جھکا دیں۔

”ماما۔“ نو عمر لڑکی نے شکایتی انداز میں اسے جھنجھوڑا۔

”آپ بنا کسی ڈر اور خوف کے بتائیں۔ ہم اس کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دلوائیں گے مسز میشا۔“

”مجھے نہیں معلوم۔ میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔“ وہ جھلا کے بے بسی سے بولی۔

تھوڑی دیر بعد تفتیشی افسر اٹھ کے گیا تو میشا نے فون نکالا۔ پھر آنسو پونچھتے ہوئے ایک چیٹ کھولی جس پہ لکھا تھا ”پی ایم فاتح رامنزل“۔ اس نے کپکپاتی انگلیوں سے میسج ٹائپ کرنا شروع کیا۔

”کیا آپ کی مدد کی آفر ابھی تک برقرار ہے؟“

پیغام بھیج کے اس نے سرگھٹنوں میں جھکا دیا۔ آنسو اب بھی گرتے جا رہے تھے۔

☆☆=====☆☆

پترا جایا پہ سرما کی چمکیلی سی صبح بہت سی تازگی لیے آئی تھی۔ آج منہ اندھیرے سے ہلکی ہلکی باش شروع ہوئی تھی جو ختم ہونے

کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اکثر لوگ آج گھروں میں دبکے تھے۔ کام پہ تاخیر سے جانے کا ارادہ تھا۔

سری پر دھانہ کی اونچی کھڑکیوں سے محل کے وسیع و عریض سبزہ زار بارش میں بھیگتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ایک

راہداری میں کھڑی ایک کھڑکی کے شیشے پہ لڑھکتے قطرے دیکھ رہی تھی۔

فاتح کا پی ایس اپنے ڈیسک پہ بیٹھا اس خاص مہمان کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جب سے آئی تھی، کھڑکی کنارے کھڑی تھی۔ یہاں سے باہر کا گھاس بھیلتا دکھائی دے رہا تھا۔ سفید کوٹ اور اسکرٹ پہنے، کندھوں تک آتے سیاہ بال کھلے چھوڑے، اس نے کانوں میں سفید موتی پہن رکھے تھے۔ وہ یہاں کھڑی کوئی سفید مورت لگتی تھی۔

”آپ اندر جاسکتی ہیں۔“ پی ایس نے کھنکھار کے تالیہ کو اطلاع دی تو وہ دھیرے سے پلٹی اور لکڑی کے اونچے دروازوں کی جانب بڑھ گئی۔

وہ پہلی دفعہ سری پردھانہ آنے والوں سے مختلف تھی۔ پی ایس اس کو صرف خبروں اور ٹی وی کی حد تک جانتا تھا۔ پھر بھی اسے دیکھ کے عجیب سا احساس ہوا تھا۔ لوگ سری پردھانہ میں پہلی دفعہ آ کے رعب کا شکار، مسحور نظر آتے تھے۔ البتہ وہ جس انٹھی گردن کے ساتھ آئی تھی، اسی انٹھی گردن کے ساتھ اندر چلی گئی۔

ایسے جیسے وہ اس سے بڑے محل دیکھ چکی ہو۔ جیسے وہ ایسے ہی محلوں میں بڑی ہوئی ہو۔

دروازے سے پردھان منتری کی کرسی کا فاصلہ چند گز تھا۔ تالیہ نے اندر قدم رکھا تو فاتح بے اختیار اپنی کرسی سے اٹھا۔

”وہ یکلم بیک۔“ وہ مسکرا کے بولا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ تالیہ نے قدم اس کی طرف بڑھائے۔ ہر قدم کے ساتھ زمین جیسے لپٹی جا رہی تھی۔ ماضی ایک فلم کی طرح نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔

تنگو کامل کی نوکرانی بن کے اس نے فاتح کو پہلی دفعہ جوس پیش کیا تھا۔ ایک قدم.....

عصرہ کی گیلری میں وہ سنہرے بالوں والی لڑکی اس سے ملی تو اس نے اسے تاشہ کہہ کے پکارا....

چار قدم.....

وہ عصرہ اور اشعر کے ساتھ ان کی ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھی گھائل غزال کی اصلیت نہ بتا سکی تھی۔

وہ سن باؤ کے گھر کی زیر زمین سیڑھیوں کے نیچے کھڑی تھی جب اس نے ایڈم اور فاتح کو ایک ساتھ نیچے آتے دیکھا۔

پانچ قدم۔

وہ تینوں آگے پیچھے جنگل میں چل رہے تھے.... چھ قدم.....

وہ جیا میں کھڑا چائے پیالیوں میں ڈال رہا تھا.... وہ شہزادیوں کا تاج پہنے بگھی سے اتر رہی تھی.....

سات قدم.....

وہ قید میں زخمی حالت میں پڑا تھا اور وہ اس کے گال کے زخم پہ مرہم رکھ رہی تھی۔
اٹھ قدم.....

وہ اسے بھول چکا تھا اور وہ اس کی چیف آف اسٹاف بنی اس کے لیے کافی کے گم بھاگتی ہوئی لار ہی تھی۔
نو قدم.....

وہ اس کے آفس میں کھڑی اسے بتا رہی تھی کہ وہ استعفیٰ دے رہی ہے کیونکہ وہ دوسرے سیاستدانوں جیسا نکلا ہے.....
وہ دونوں یاں سوفو کے کنویں پہ بیٹھے تھے اور اس نے بالوں میں پھول اٹکار کھا تھا.....
دس قدم.....

وہ الاؤ کے پاس بیٹھے تھے..... اس قدیم قلعے میں..... اور وہ دیوار پر وہ نظم لکھ رہی تھی.....
گیارہ قدم.....

اور وہ اس کے سامنے تھا۔ فاصلے ختم ہو چکے تھے۔
”بیٹھو۔“

وہ کرسی کھینچ کے بیٹھی۔ سارے ماہ و سال کہیں گم ہو گئے۔ فضا میں عجیب سا سحر بکھر گیا۔
”تم کیسی ہو؟“ وہ آگے کو جھکے اس کی آنکھوں میں جھانک کے پوچھ رہا تھا۔ تالیہ نے ابرو اٹھائی۔
”میرا خیال تھا آپ پوچھیں گے کہ تم کہاں تھیں؟“ اس کی آنکھوں میں نمی در آئی۔
”کیا مجھے پوچھنا چاہیے؟“

”ہاں۔ میرا خیال تھا کہ آپ مجھ سے جواب مانگیں گے کہ میں آپ کو چھوڑ کے کیوں چلی گئی؟ کیا میں اپنے باپا کے پاس رک گئی؟ کیا آپ کو اور ایڈم کو بھیج کے میں نے ایک اور کون گیم کھیلا؟ کیا میں نے آپ کو دھوکہ دیا؟ مگر آپ....“ اس کی آنکھوں میں تعجب تھا۔ ”آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں؟ میں چھ سال تک دور رہی.... اور آپ نے جواب نہیں مانگا۔ نہ کل۔ نہ آج؟“

وہ مسکرا کے اٹھا اور پیچھے کھڑکی کے ساتھ رکھے اسٹینڈ تک گیا۔ کھڑکی پوری دیوار جتنی اونچی تھی۔ اس کے پردے کھلے تھے اور اس کے پار بارش میں بھیگتا سبزہ زار دکھائی دے رہا تھا۔

وہ تالیہ کی طرف پشت کیے بوتل سے پانی چائے کی برقی کیتلی میں انڈیلنے لگا۔

”مجھے نہیں معلوم اس روز تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا تالیہ۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میں نے سنا

کہ ایڈم تمہیں پکار رہا ہے کہ نیچے آؤ۔ لیکن جب میں نے پلٹ کے دیکھا تو ایڈم حیرت سے پیچھے دیکھ رہا تھا جہاں صرف اندھیرا تھا۔ ہم دونوں پیچھے کو پلٹے لیکن دروازہ ایک سیاہ دیوار میں بدل چکا تھا۔ پیچھے کا راستہ ختم ہو چکا تھا۔ میں واپس مڑا تو دیکھا، سامنے ایک اور دروازہ تھا۔ نہ اس دفعہ کوئی دریا تھا، نہ کوئی بارش۔ وہ چابی جو یان سو فو نے بنائی تھی، وہ عجیب سی تھی۔ میں نے آگے کا دروازہ کھولا تو ہم جو کمراسٹریت پہ نکل آئے تھے۔ تم ہماری ساتھ نہیں تھیں اور میں زخمی تھا۔“

وہ گردن جھکائے اب کیتلی پہ ٹائمر سیٹ کر رہا تھا۔ مٹن دبا کے وہ اس کی طرف مڑا اور اسٹینڈ سے ٹیک لگائے، ہتھیلیاں دونوں اطراف میں میز پہ جمائے، اس کو دیکھ کے کہنے لگا۔

”میں زیادہ دیر ہوش میں نہیں رہ سکا تھا۔ ایڈم کہاں گیا، مجھے معلوم نہیں ہو سکا۔ لیکن جب میں ہسپتال میں جا گا تو اشعر میرے ساتھ تھا۔ میں نے تمہارے بارے میں دریافت کیا لیکن کسی نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ ایڈم کے بارے میں سنا کہ وہ ٹراما سینٹر میں ہے۔ اس کی یادداشت کھو گئی ہے۔ میں ایک دو دفعہ اس سے ملنے گیا لیکن وہ مجھے نہیں پہچانتا تھا۔ اس کا ذہن اس دن تک واپس چلا گیا تھا جب وہ میرا باڈی گارڈ بنا تھا۔ میں نے اسے زیادہ تنگ نہیں کیا اور واپس اپنی زندگی میں چلا گیا۔“

”آپ نے استعفیٰ واپس لے لیا؟“ اس نے آنسوؤں کا گولہ بدقت لگلا۔

”ہاں۔ لیکن میں ہر چیز سے بد دل ہو گیا تھا۔ چند ماہ تک ہر روز سونے سے پہلے میں سوچا کرتا تھا کہ تالیہ نے ایسا کیوں کیا؟ وہ کیوں واپس نہیں آئی؟ کیا اس نے یہ جان بوجھ کے کیا؟“

کیتلی کی گھنٹی بجی تو وہ مڑا اور کیبنٹ سے دو گنگ نکال کے رکھے۔ پھر کیتلی اٹھائی۔ اس کے اندر پانی گرم پانی ابل رہا تھا اور کھڑکی کے باہر ٹھنڈا پانی برس رہا تھا۔

”میں نے ذوالکفلی کو ڈھونڈنا چاہا۔ وہ نہیں ملا۔ میں نے شکار بازوں کو تلاشا۔ شاید کوئی تمہیں اس دنیا سے واپس لے آئے۔ میرا خیال تھا تم وہاں پھنس گئی تھی۔ چند ماہ تک میں خود فراموشی کی حالت میں رہا۔ میرا کیرئیر متاثر ہوا۔ دوسرے لوگ میری کرسی پہ نظر رکھنے لگے۔ تب مجھے تم سے گلے بھی تھے اور شکایات بھی۔ تب تم واپس آ جاؤ تو شاید میں حساب مانگتا۔“

وہ اب گرم ابلیتی دھار گنگ میں انڈیل رہا تھا۔ گردن جھکی تھی اور الفاظ ٹھہر ٹھہر کے لبوں سے نکل رہے تھے۔

”لیکن تالیہ..... انسان کو معلوم بھی نہیں ہوتا اور ایک روز وہ نیند سے جاگتا ہے تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے دکھ کو ہرا دیا ہے۔ وہ غم اس کے دل کو اب نہیں کاٹ رہا۔ انسان نیند سے جاگتا ہے اور اسے ایک دم سے اس کا کلوزر closure مل جاتا ہے۔ غم کو کنارہ مل جاتا ہے۔“ اس نے ٹی بیگ کپ میں ڈالا۔ پانی کارنگ تیزی سے سنہرا ہونے لگا۔

”میں ایک صبح اٹھا اور مجھے احساس ہوا کہ تم نے وہ جان بوجھ کے نہیں کیا تھا۔ میں تمہیں جانتا تھا۔ تم کسی مسئلے میں گرفتار

ہو گئی ہوگی۔ تمہارے باپا کی کوئی سازش۔ کوئی وقت کا چکر۔ یہ قسمت تھی اور مجھ سے قبول کرنا تھا۔“

دوسرے مگ میں اس نے چائے ڈال کے کیتلی رکھی۔ پھر چینی کے کیوبز دونوں مگوں میں ڈالے۔ پھر انہیں اٹھائے اس کے سامنے آیا۔ اس کا مگ رکھا اور اپنا لیے واپس اپنی کرسی پہ بیٹھا۔

”ان چھ سالوں میں کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب مجھے تمہارا خیال نہ آیا ہو۔ اور میں ہمیشہ تمہاری خیریت کا سوچتا تھا۔ تم اس دنیا میں ہو یا اس دنیا میں.... میری دعا تھی کہ تم ٹھیک رہو۔ کل تم سے ملنے سے پہلے تک میرے ذہن میں واقعی سوالات تھے لیکن اب نہیں ہیں۔“

”کیوں؟ کل مجھے دیکھ کے کیا لگا آپ کو؟“

دونوں مگ میز پہ یوں رکھے تھے کہ ان کی اڑتی بھاپ ان دونوں کے درمیان بار بار حائل ہو جاتی تھی۔ وہ اس سوال پہ مسکرا دیا۔

”میں نے پچھلے چھ سال تمہاری ہر بات پہ غور کیا ہے۔ ہر کون ہر حرکت جو تم نے میرے سامنے کی یہاں تک کہ مجھے تمہارے چہرے کا ایک ایک تاثر یاد ہوتا گیا۔ تالیہ کب خوش ہوتی ہے۔ تالیہ کب خوشی ظاہر نہیں کرتی۔ کب وہ کامیاب ہوتی اور کب بے بس۔ تالیہ کی cryptic باتوں کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے میں نے تمہاری غیر موجودگی میں تمہیں زیادہ اچھے سے پڑھ لیا ہے۔“

”اور؟“ اس نے سنجیدگی سے ابرو اٹھایا۔

”اور کل تمہیں دیکھ کے مجھے اندازہ ہو گیا کہ تم خوش ہو۔“ اس نے مگ لبوں سے لگاتے ہوئے مسکرا کے کہا۔

”میرے اوپر ایک مرڈر ٹرائل چل رہا ہے۔ میں تھانے میں ایک دن گزار کے آئی ہوں۔ مجھے سارا ملک مجرم سمجھ رہا ہے۔ میری زندگی کے چھ سال کھو گئے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں خوش ہوں؟“

”ہاں۔ جب تم نے کہا وقت تم پہ مہربان رہا ہے تو میں سمجھ گیا تھا کہ تمہیں کچھ مل گیا ہے۔ کوئی ایسی خوشی جو تم شیئر نہیں کر سکتیں۔ لیکن وہ تمہارے انگ انگ سے پھوٹ رہی ہے۔“ وہ ٹیک لگائے گھونٹ بھرتے ہوئے غور سے اسے دیکھ کے کہہ رہا تھا۔ ”اور میں نے تمہاری انٹرویو گیشن کی ویڈیو بھی دیکھی تھی۔ وہ سب ایک ایکٹ تھا۔ مجھے پتہ ہے۔“

”واؤ۔“ وہ مسکرا دی۔ ”آپ جانتے ہیں اس رات کیا ہوا تھا؟“

”میں سننا چاہوں گا۔“

”وقت نے میرے ساتھ چال چلی۔ میں دروازے میں دیر سے داخل ہوئی۔ شاید چھ سیکنڈ دیر سے۔ اور جب میں باہر

جو نکرا سٹریٹ پہ لنگی تو چھ برس گزر چکے تھے۔“

”اوہ۔“ اس کے لب تعجب سے سکرے۔

”آپ لوگوں نے ایک زمانہ میرے بغیر گزار لیا۔ لیکن میں؟ میرے چھ سال کھو گئے۔ اور اب وقت کو واپس جگہ پہ لانے کا کوئی طریقہ میرے پاس نہیں بچا۔ میں آج بھی وہیں کھڑی ہوں۔ مجھے ابھی عصرہ کے قتل کا الزام ہٹانے کے لیے ایک لمبی لڑائی لڑنی ہے۔“

”میں نہیں جانتا مجھے کیا کہنا چاہیے۔ لیکن میں نے تمہیں مس کیا تالیہ۔ بہت زیادہ۔“

وہ زخمی سا مسکرا دی۔ ”میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کیونکہ کوئی چھ دنوں میں کسی کو کتنا مس کر سکتا ہے؟“

”مگر تم خوش ہو۔ کیوں؟“ فاتح نے گھونٹ بھر کے مگ میز پہ رکھ دیا۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر برقی بارش اب تھمنے کو تھی۔

”آپ واقعی مجھے جانتے ہیں۔“ وہ دھیرے سے ہنس دی تھی۔ ”میں واقعی خوش ہوں“ فاتح۔ مجھے بالآخر وہ مل گیا ہے جس کی مجھے عرصے سے تلاش تھی۔“

”تمہاری بے گناہی کا ثبوت؟“

”اؤں ہوں۔ ابھی تک میرے پاس کوئی خاص ثبوت نہیں ہے۔ لیکن میرے پاس کچھ اور ہے۔“ وہ مبہم سا مسکرا کے کہتی اٹھی۔ ”میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ ہم ملتے رہیں گے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ آپ اتنے عرصے بعد بھی نہیں بدلے۔ آپ آج بھی مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”اور میں خوش ہوں کیونکہ تم خوش ہو۔ میں ریلیف محسوس کر رہا ہوں۔ تمہیں اس اطمینان اور بہادری کے ساتھ ان الزامات کا مقابلہ کرتے دیکھ کر۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں تمہیں اس معاملے سے نکال لوں گا۔ لیکن اب مجھے نہیں لگتا کہ تالیہ مراد کو میری مدد کی ضرورت ہے۔“

”جو مجھے آتا ہے وہ میری جان ہمیشہ بچاتا رہے گا۔“ اس نے سر کو تعظیماً جھکایا۔ پھر اطراف میں اس پر تعیش آفس کو دیکھا۔

”یہ عہدہ پا کے کیسا لگتا ہے؟ فاتح؟ سوری میں آپ کو دوسری تو انکویا یا نگ دی امان بر حرمت وغیرہ نہیں کہہ سکوں گی۔“

”میں مانسٹ نہیں کروں گا۔“ اس نے کندھے چکاتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ ”اور یہ گفتگو کسی اور وقت کے لیے سہی۔ لیکن کیا تم

مجھے نہیں بتاؤ گی کہ تم خوش کیوں ہو؟“

”آپ جان جائیں گے۔“ وہ مبہم سا مسکرا کے کہتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ نہ کوئی گلہ نہ قسمت کی ستم ظریفی کا

مذکرہ۔ وہ چھ دن بعد ملے تھے۔ اور وہ ویسا ہی تھا۔

وہ چھ سال بعد ملے تھے۔ اور وہ ویسے ہی تھی۔

ایک دفعہ پھر دونوں نے ایک دوسرے کی زندگی میں اپنی موجودگی کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا۔ ایک دفعہ پھر وہ مشکل گفتگو ان کے درمیان آڑے آگئی تھی۔

وہ ان اونچے دروازوں سے نکلی تو ہال کے پار دروازے کے سامنے اشعر محمود کھڑا تھا۔ تھری پیش میں نک سک سے تیار وہ تندی سے اسے گھورے جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کے تالیہ کھلے دل سے مسکرائی اور اس کی طرف آئی۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ وہ ماتھے پہ شکنیں ڈال کے بولا۔

”مجھے پردھان منتری نے بلایا تھا۔ آپ کو اعتراض ہے کیا؟“ امیر داٹھا کے پوچھا۔

اشعر نے ایک کامن روم کی طرف اشارہ کیا اور خود اس طرف بڑھ گیا۔ وہ پیچھے آئی۔ اندر آ کے اس نے دروازہ بند کیا اور اس کی طرف گھوما۔

”میں نے سنا ہے پولیس کو ایک کنٹینر ملا ہے۔ اور قتلگر پرنٹس وغیرہ بھی۔ ان کا بیچ ڈھونڈا جا رہا ہے۔“ وہ دبی آواز میں غرایا۔ تالیہ نے مسکرا کے شانے اچکائے۔

”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں نے اپنے ماسک پہنے اغوا کار کو زخمی کیا تھا اور اس نے مجھے۔ معلوم نہیں ماسک کے پیچھے کون تھا لیکن پولیس یہ ضرور دیکھے گی کہ کس کی ناک پہ زخم کا نشان ہے۔“ اس نے اشعر کی ناک کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہ پلیز۔“ وہ غصے سے بولا۔ ”تم نے مجھے فریم کرنے کے لیے بہت ہی ظاہری ثبوت چھوڑے ہیں۔ اگر میں اغوا کار ہوتا تو اس کنٹینر کو صاف کیوں نہ کرتا؟ سارے ثبوت وہیں کیوں چھوڑ دیتا؟“

”جیسے میں عصرہ کی قاتل ہوتی تو اپنے ہی کارڈ سے ایک کیوں آرڈر کرتی؟“

اشعر ایک دم بالکل لا جواب ہو گیا۔

”یہی مسئلہ ہے حقیقی دنیا کی پولیس کا اشعر۔ وہ صرف ظاہری ثبوتوں کا پیچھا کرتی ہے۔ اگر آپ کے قتلگر پرنٹس اس کنٹینر پہ

مل گئے نا اشعر... تو آپ بڑی مشکل میں پھنسنے جا رہے ہیں۔“

”تم۔“ مارے ضبط کے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ”تم اچھی طرح جانتی ہو میں نے تمہیں اغوا نہیں کیا تھا۔ پھر تم ایسا کیوں کر

رہی ہو؟“

”اور آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ عصرہ کا قتل میں نے نہیں کیا تھا۔ میں بے قصور تھی۔ میں اتنے بے وقوفانہ ثبوت

کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ لیکن مجھ سے تنفر کے باعث آپ نے سب سے پہلے مجھے الزام دیا۔ آپ کی گواہی نے مجھے مفرور ملزم بنایا۔ تو اگر میں ٹرائل کا سامنا کرنے جا رہی ہوں تو میں اکیلی کیوں جاؤں؟ آپ آرام سے کیوں بیٹھیں؟“

”میں اس کیس کو ایک چٹکی میں اپنے اوپر سے ختم کروادوں گا۔ سمجھیں آپ۔“ اس نے چٹکی بجا کے کہا اور مڑ گیا۔

”یعنی ایک دفعہ پھر اشعر محمود خود کو تالیہ کے خلاف اتنا مصروف کر لے گا کہ اسے کچھ اور نظر ہی نہیں آئے گا۔“ وہ بڑبڑاتی تھی۔

اشعر محمود جاتے جاتے رکا۔ پھر آہستہ سے پلٹا۔

”مصروف؟؟“ اسے اتنا معلوم تھا کہ تالیہ بے مصروف کوئی بات نہیں کہا کرتی تھی۔

”ہاں نا۔ مصروف۔ آپ تالیہ مراد کو گرفتار کرنے میں اتنے مصروف تھے کہ نوٹری پبلک یا میوزیم کی طرف سے آنے والی کالز پر آپ نے توجہ نہیں دی۔“

”کیسی کالز؟“

”یہی تو مسئلہ ہے۔ آپ جیسے لوگ جب حکومت میں آتے ہیں تو ہر دو ماہ بعد اپنا نمبر بدل لیتے ہیں تاکہ عام عوام کی رسائی سے دور ہو جائیں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔ ”اس لیے نوٹری والوں کا آپ سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ وہ عصرہ کی وصیت پہ عمل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن چونکہ آپ وصیت کے ایگزیکوشنر نہیں تھے۔ اس لیے انہوں نے آپ کو زیادہ تنگ نہیں کیا اور وصیت پہ عمل درآمد کروا دیا۔“

”اوہ۔ وہ لہٹیک نوار دات؟“ اشعر نے گہری سانس لی۔ ”مجھے معلوم ہوا تھا کہ میوزیم وہ آپ کے حوالے کرنے جا رہا ہے۔ پہلی بات ان کی کوئی خاص ویلیو نہیں ہے۔ دوسری بات اس وصیت کے خلاف میرا ایک کلیم چٹکی میں (چٹکی بجائی) اس کو منسوخ کروا سکتا ہے۔ وہ لہٹیک میرے خاندان کی ملکیت تھے۔ اور میرے ہی رہیں گے۔“

”وہ لہٹیک جس میوزیم کے پاس امانت تھے انہوں نے کل وہ مجھے دے دیے تھے کیونکہ وصیت کے مطابق ان پہ میرا حق تھا۔“

”سو؟ میں ابھی عدالت میں کلیم جمع کروادوں گا اور وہ مجھے واپس مل جائیں گے۔ اگر آپ نے وہ بیچ دیے تو آپ کو ان کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔“

تالیہ لمحے بھر کو چپ ہوئی۔ پھر سر ہلایا۔ ”آپ درست کہہ رہے ہیں۔ آپ سول کلیم داخل کرا کے انہیں واپس لے سکتے ہیں۔ جب میں واپس آئی تھی تو سب سے بڑا عذاب مجھے یہ لہٹیک لگے تھے جو عصرہ نے میرے گلے ڈال دیے تھے۔ لیکن

پھر مجھے احمد نظام نے ایسی بات بتائی جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ وقت مجھ پہ بہت مہربان رہا ہے۔“

”کیا؟“ وہ پتلیاں سکڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

”یہ کہ ملائیشیا میں سول مقدمے کا ایک statute of limitation ہوتا ہے۔ آپ وکیل ہیں۔ آپ کو یاد ہے کتنی میعاد تک آپ کسی کے خلاف سول مقدمہ دائر کر سکتے ہیں؟“

اشعر محمود کی رنگت ایک دم سفید پڑی۔ اس نے تیزی سے میل فون نکالا۔ مگر وہ مسکرا کے کہے جا رہی تھی۔

”میں نے احمد نظام سے پوچھا کہ چھ سال میں کیا بدل جاتا ہے۔ تو انہوں نے بتایا کہ آپ ملائیشیا میں پورے چھ سال تک سول مقدمہ دائر کر سکتے ہیں۔ اگر کسی معاملے کو چھ سال گزر چکے ہوں تو آپ مقدمہ نہیں دائر کر سکتے۔ اب آپ کے سول کلیم کی میعاد ختم ہو چکی ہے۔ عدالت آج وہ نوار دات مجھے دے دے گی اور آپ کچھ نہیں کر سکتے۔“ پھر وہ رکی اور محفوظ انداز میں اضافہ کیا۔

”جب عصرہ نے ان کو میرے نام لگایا تھا تو ان کو نہیں معلوم تھا کہ یہ نوار دات جن اصل شہ پاروں کا حصہ ہیں وہ صدیوں سے زمین میں دفن ہیں۔ اس وقت ان کی کوئی ویلیو نہیں تھی۔ لیکن چند ماہ پہلے ہانگ کانگ میں کھدائی کے دوران ملا کہ کی تہذیب کے چند ایسے نوار دات ملے تھے جنہوں نے عصرہ کے ان بے کار نامہ مکمل ٹکڑوں کی اہمیت آسمان پہ پہنچا دی ہے۔ لیکن آپ کو علم کیوں نہ ہو سکا؟“

اشعر بس ششدر سا اسے سنے جا رہا تھا۔

”تین باتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو میوزیم کے کیوریٹرز نے یہ بات آپ سے چھپائی کیونکہ وہ انہیں اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ یا آپ اپنی سیاست میں اتنے مصروف رہے کہ آپ کو معلوم نہیں ہو سکا کہ غیر ملکی کلیکٹر ان نوار دات کی قیمت کئی ملین ڈالرز تک پہنچا چکے ہیں۔ یا آپ کو ان کی اصل قیمت معلوم تھی لیکن آپ انہیں فاتح کی فیملی کو نہیں دینا چاہتے تھے ورنہ کب کا کلیم داخل کروا چکے ہوتے۔ لیکن مجھے.....“ دھیرے سے اپنے سینے پہ انگلی سے دستک دی۔

”مجھے آرٹ کی پہچان بھی ہے..... اور میرے آرٹ کی دنیا سے روابط بھی ہیں۔ وہ نوار دات اب صرف میرے ہیں۔“ وقت“ کو معلوم تھا کہ ان کی تب اہمیت نہیں ہے۔ ”وقت“ نے ان کو قیمتی بنایا اور مجھے اتنی مہلت دی کہ آپ ان کو مجھ سے چھین نہ پائیں۔“

اشعر محمود تیزی سے موبائل پہ نمبر ملارہا تھا۔ ”میں تمہیں دیکھ لوں گا۔ میں سول کلیم داخل کر کے دکھاؤں گا۔“

”یہ کام آپ کو بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔ لیکن آپ نے جان بوجھ کے نہیں کیا۔ میرا خیال ہے آپ کو ان کی اہمیت معلوم

تھی۔ آپ صرف انہیں فاتح کے بچوں کو نہیں دینا چاہتے تھے۔“

وہ بکنا جھکتا، فون کان سے لگا تا تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کی رنگت سرخ پڑ رہی تھی اور حواس اڑتے جا رہے تھے۔
تالیہ مسکرائی اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

اس کو بالآخر وہ خزانہ مل چکا تھا جس کی اسے برسوں سے تلاش تھی۔

وقت اس پہ بہت مہربان رہا تھا۔

☆☆=====☆☆

جھیل کا پانی سرما کی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ دو بطنیں ست روی سے تیرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ گاہے بگا ہے وہ اپنے گرد نیس پانی میں ڈالتیں اور پھر سردائیں بائیں ہلاتے ہوئے اسے باہر نکالتیں۔ ارد گرد چھینٹے اڑتے جاتے۔ البتہ جھیل کنارے رکھا واحد بیج ان کے چھینٹوں کی پہنچ سے دور تھا۔

بیج پہ ایڈم بن محمد بیٹھا تھا۔ سفید ہائی نیک جرسی پہنے وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے موبائل پہ کچھ دیکھ رہا تھا۔ ایڈم کی پشت پہ تالیہ بنا آواز کے قدم اٹھاتی آئی۔ دھیرے سے سفید ہیٹ اتارا اور اس کے ساتھ بیج پہ رکھا تو وہ چونکا اور پلٹ کے دیکھا۔ پھر رسمی سا مسکرایا۔

”آپ کا ٹیکسٹ کافی دلچسپ تھا۔ آپ نے لکھا کہ آپ کے ہاتھ خزانہ لگ گیا ہے۔“

”ہوں۔“ وہ مبہم سا مسکراتی ہوئی آگے آئی اور اس کے ساتھ بیٹھی۔ دونوں کا چہرہ اب جھیل کی طرف تھا اور ان درمیان سفید ہیٹ رکھا تھا۔

”مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آج عصرہ محمود کے وصیت کردہ نوادرات آپ کو تفویض کر دیے گئے ہیں۔“

تالیہ نے گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ اس کی مسکراتی آنکھوں میں ڈوبتے سورج کا عکس تھا۔

”اپنی معلومات آپ ڈیٹ کر لیں۔ میں نوٹری پبلک سے آرہی ہوں۔ نہ صرف نوادرات مجھے مل گئے ہیں بلکہ میں نے

انہیں موقع پہ فروخت بھی کر دیا ہے۔“

”اتنی جلدی گا بک کیسے مل گئے آپ کو؟“

”میں اتنے دن سے گا بک ہی تو تلاش کر رہی تھی۔ تاکہ وصیت پہ عمل درآمد ہوتے ساتھ ہی سیل مکمل کر دوں۔ مجھے میری

رقم مل چکی ہے اور نوادرات اپنے نئے مالکوں کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ اب مجھے ان کے چوری ہونے کا ڈر بھی نہیں ہے۔“

”دلچسپ۔ چھ سال کی قانونی میعاد نے آپ کو بچالیا۔ کیا آپ اسی لیے چھ سال بعد آئی ہیں تاکہ آپ ان نوادرات کو

حاصل کر لیں؟“ ایڈم نے نوٹ بک نکالی اور گھٹنے پہ اس کو رکھ کے کچھ لکھنے لگا۔

”میں جانتی تھی آپ یہ سوچیں گے۔ بلکہ عدالت بھی یہ سوچے گی۔ احمد نظام نے بھی یہی کہا تھا لیکن مجھے پرواہ نہیں۔ میں بس یہ چاہتی تھی کہ اشعر محمود کو اس بارے میں کم سے کم معلوم ہو۔ اور ایسا ہی ہوا۔ معلوم ہونے کے باوجود بھی وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن ایسے مزانہ آتا۔“ اب وہ مسکرا کے جھیل کے پانی کو دیکھ رہی تھی۔

”کیا میں اس وقت کو الہ پور کی امیر ترین خواتین میں سے ایک کے ساتھ بیٹھا ہوں؟“ وہ مسکرا کے پوچھنے لگا۔

”میں آج فاتح سے ملی۔“ وہ اس کا سوال نظر انداز کر کے دور تیرتی ہوئی بطنخوں کو دیکھ کے بولی۔

”ہوں۔ گڈ۔ اور کیا نتیجہ نکلا اس ملاقات کا؟“ وہ لکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”ان کی زندگی میں میری جگہ نہیں ہے۔“ وہ اداسی سے بولی۔ ”حالانکہ وہ میرے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آئے۔ وہ مجھے دیکھ کے خوش بھی ہوئے۔ لیکن ایڈم..... انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا اور اس کی جگہ کسی کی زندگی سے وقت کے ساتھ کتنی آسانی سے ختم ہو جاتی ہے۔“

”کیا میں یہ بھی لکھ دوں؟“ اس نے رسمی انداز میں پوچھا۔ وہ چہرہ موڑ کے بس اس کو دیکھنے لگی۔

”آپ ہماری زندگی کا اتنا اہم حصہ تھے اور اب آپ پوچھ رہے ہیں کہ کیا آپ یہ لکھ دیں؟“ اس کے انداز میں گلہ تھا۔ ایڈم نے گہری سانس لی۔

”مس مراد.... میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میری یادداشت میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔“ اس کا چہرہ سپاٹ سا تھا جیسے کسی ایسے اجنبی کا ہوتا ہے جسے کام کے باعث کچھ وقت ایک اجنبی کے ساتھ گزارنا پڑے۔ شائستہ مہذب پیشہ ورانہ لیکن اجنبی رویہ۔

”اچھا ہوا آپ کو یاد نہیں ہے۔ ورنہ میرے اور آپ کے درمیان ایک تکلیف دہ یاد تھی جس کے بارے میں ہم کبھی بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔“

”اچھا؟ کیسی یاد؟“ اس کے انداز میں معمولی سی دلچسپی در آئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور جھیل ان کے سامنے پرسکون سی بہتی ان کو تک رہی تھی۔ بطنخیں اب تیرتی ہوئی دور جا رہی تھیں۔

تالیہ چند لمحے اس کو دیکھتی رہی پھر مسکرا کے سر جھٹک دیا۔ ”کچھ نہیں۔“

”ظاہر ہے اب میں اصرار کروں گا کہ آپ مجھے بتائیں۔“

”میری وجہ سے آپ کے چوزے کھوئے تھے نا۔ آپ مجھے ان کے لیے مورد الزام ٹھہراتے تھے۔“ وہ نرم آنکھوں سے مسکرا

کے بولی۔ تو ایڈم نے پتلیاں سکوڑ کے اس کا چہرہ دیکھا۔

”آپ نے یہ بات گھڑی ہے۔ ورنہ میں اپنے چوزوں کی موت پہ یوں کسی کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔“ وہ ہلکا سا ہنس کے واپس ڈائری پہ کچھ لکھنے لگا۔

”بس.... یہی چیز.... اسی کا میں انتظار کر رہی تھی۔“ وہ تیزی سے اس کی طرف گھومی تو ایڈم نے سوالیہ نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ شہزادی کی مسکراتی آنکھوں میں چمک تھی۔

”کیا؟“

”میں نے کب کہا کہ چوزے مر گئے تھے؟ میں نے کہا کہ وہ کھو گئے تھے۔“

ایڈم کا قلم چلاتا ہاتھ رک گیا۔ وہ ٹھہر کے اسے دیکھنے لگا۔

جھیل کا پانی بھی ساکت ہو گیا اور طغیئیں مڑ کے انہیں دیکھنے لگیں۔

”آپ نے خود ہی مجھے اس دن بتایا تھا کہ...“ وہ الجھ کے کہنے لگا لیکن تالیہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

”بس کرو، ایڈم.... کتنی اداکاری کرو گے؟ مجھے معلوم ہے تمہیں کچھ نہیں بھولا۔“

وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کے بولی۔ وقت ان کے آس پاس ہی ٹھہر گیا۔

”مجھے پہلے دن پہلے لمحے سے معلوم ہے کہ تمہیں سب یاد ہے۔ میں نے تمہیں تمہارا وقت دیا۔ اب بس کرو۔“

ایڈم نے قلم کا ڈھکن چڑھایا، اسے جیب میں رکھا اور نوٹ بک کو پیٹ کی جیب میں ڈالا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ

بالکل سٹاٹ تھا۔ تالیہ نے گردن اٹھا کے اسے دیکھا۔

”تم اچھی اداکاری کر لیتے ہو لیکن میں تمہیں جانتی ہوں۔ تم نے باپا سے کہا تھا کہ اب ایڈم بن محمد اپنے لیے جیے گا۔ جب

میں نے تمہاری یادداشت کا سنا تو جان گئی کہ تم نے وہ ناک اسی لیے چھپایا ہے۔ تمہیں دیکھ کے یقین بھی ہو گیا۔“ وہ گردن اٹھا

کے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وہ جھیل کو دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں یہ لگتا ہے کہ تم مجھ سے ناراض ہو؟ اسی لیے صرف پروفیشنل وجہ سے میرے ساتھ کام کر رہے ہو؟ تم ناراض ہو کہ

میں نے اتنے برس رابطہ کیوں نہیں کیا؟ غلط۔ تم خود سے جھوٹ بول رہے ہو۔ اگر تم مجھ سے ناراض ہوتے تو میری اتنی مدد نہ

کرتے۔“

ایڈم نے چہرہ موڑ کے اسے دیکھا۔ اس کی رنگت دہکتی گلابی ہو چکی تھی اور آنکھوں میں سرخی تھی۔

”آپ کیا سمجھتی ہیں؟ آپ اتنے سال بعد کسی کی زندگی میں ایک دفعہ پھر سے وارد ہو جائیں گی اور وہاں آپ کے لیے

جگہ ہوگی؟ سب کچھ پہلے جیسے ہو جائے گا؟ نہیں، چے تالیہ۔ آپ نے پیچھے رہنے کو خود چنا تھا۔ آپ نے مجھے چھوڑ دینے کو خود چنا تھا۔ میری زندگی میں اب آپ کی جگہ نہیں بچی۔“ یہ کہہ کے اس نے قدم آگے بڑھا دیے۔

وہ چپ چاپ اسے دور جھیل کی طرف جاتے دیکھے گئی۔ وہ پانی کے قریب جا کے کھڑا ہو گیا تھا۔ پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے وہ اب پانی کے اوپر ڈوبتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔

تالیہ نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ اسے ایڈم کو پورے دس منٹ کے لیے اکیلا چھوڑنا تھا۔ اس کا غصہ اور شرمندگی دس منٹ میں جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گی۔ وہ جانتی تھی۔

اس نے ہیٹ سر پہ رکھا اور گھڑی کو دیکھتے ہوئے ایک ایک سیکنڈ گننے لگی۔

پچھلے سال ہوں یا پچھلے دن، تالیہ مراد ایڈم بن محمد کے ہر انداز سے واقف تھی۔

یہ سارے کون گیسز اسی نے ایڈم کو سکھائے تھے۔ استاد کو کون مات دے سکا ہے بھلا؟

☆☆=====☆☆

وان فاتح کی رہائش گاہ کے مرکزی لاونج میں اس وقت ملازموں کی ایسی چہل پہل پھیلی تھی جیسی کسی مہمان کی آمد کے وقت ہوتی ہے۔ کوئی گیسٹ روم سیٹ کرنے جا رہا تھا۔ تو کوئی میٹھا کے ٹرائی بیگز لیے ایک طرف جا رہا تھا۔

”یہاں آپ بالکل محفوظ ہوں گی۔ کوئی آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا، مسز میٹھا۔“

وسط لاونج میں کھڑی جولیانا بہت اپنائیت سے میٹھا کا ہاتھ تھامے کہہ رہی تھی۔ میٹھا اور اس کی بیٹی کے چہرے بچھے بچھے تھے۔ زرد خوف اور بے یقینی کا شکار چہرے۔

”مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا یوں، جولی۔“ میٹھا نے لاونج کی میز پہ ہینڈ بیگ رکھتے ہوئے یاسیت سے کہا۔ ”ایسے خود کو کسی کے اوپر بوجھ بنانا غیر مناسب ہے۔“ وہ شدید غیر آرام دہ لگتی تھی۔

”کم آن مسز میٹھا... آپ اتنے برسوں سے ہماری فیملی کا حصہ ہیں۔ جب تک وہ گرفتار نہیں ہوتا، آپ یہاں محفوظ رہیں گی۔“

”ہاں لیکن میں نے داتو سری کو بتا دیا تھا کہ یہاں ٹیمٹ صرف اس کے گرفتار ہونے تک ہے۔ جیسے ہی وہ پکڑا گیا، ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔“

”جی مسز میٹھا۔ اور آپ اتنی شرمندہ نہ ہوں۔ یہ ویسے بھی ڈیڈ کا آئیڈ یا تھا کہ آپ یہاں رہیں۔ ورنہ آپ تو غیر ملکی پناہ کے لیے اپلائی کرنے کا کہہ رہی تھیں۔ بھاگنا اس مسئلے کا حل تو نہیں ہے۔“

میشا نرمی سے مسکرا دی۔ ”تم کتنی سمجھدار ہو گئی ہو، جولی۔“ اور پھر گردن اٹھا کے اس محل نما گھر کی اونچی چھت کو دیکھا۔
 ”مجھے برا اس لیے لگ رہا ہے کیونکہ میں نے پہلی دفعہ تمہاری فیملی سے تعلق کا فائدہ اٹھایا ہے۔ اور میرے ضمیر پہ یہ چیز
 بہت بوجھ دے رہی ہے۔ ان شاء اللہ میں اس فیور کو ضرور لوٹاؤں گی۔“ وہ مسکرا کے بولی تو جولی انہ نے بھی مسکرا دی۔
 ”میں آپ کو آپ کا روم دکھاتی ہوں۔ آجائیں۔“ وہ خوشی خوشی ان دونوں کو لیے راہداری کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆=====☆☆

تالیہ نے گھڑی دیکھتے ہوئے گنتی مکمل کی اور بیچ سے اٹھی۔ وہ ابھی تک پانی کے قریب کھڑا تھا۔ تالیہ کی جانب پشت تھی۔
 وہ اس سے چند قدم پیچھے رکی اور کھنکھاری۔

”اگر تم اتنے خفا ہو تو ابھی تک یہاں کیوں ہو؟“

جواب میں اس نے خفگی سے تالیہ کو دیکھا اور جانے کے لیے تیزی سے مڑا۔ وہ سرعت سے اس کے سامنے آکھڑی
 ہوئی۔ ایڈم کا راستہ رک گیا۔

”تم مجھ سے خفا نہیں ہو مان لو۔“ وہ زور دے کر بولی۔

”مجھے آپ سے خفا ہونے کا حق بھی نہیں ہے۔“ وہ اتنی ہی تندی سے بولا۔ اس کا چہرہ اب کسی اجنبی کا چہرہ نہیں تھا۔ یہ ایڈم
 تھا۔ پرانا ایڈم۔

”تم سمجھتے ہو میں جان بوجھ کے پیچھے رہ گئی؟ یہی سوال میں تم سے پوچھوں اگر؟ تم میرے بغیر کیوں گئے؟ میرا انتظار کیوں
 نہیں کیا؟ دروازہ کیوں بند کر دیا؟ جانتے ہو میں چھ سال کے لیے وقت کے دروازے میں مقید ہو گئی تھی۔“

وہ اتنی درشتی سے بولی کہ ایڈم کے تاثرات بدلے۔ ماتھے کی سلوٹیں غائب ہوئیں۔

”واٹ؟ آپ چھ سال کے لیے قید ہو گئی تھیں؟“

”آف کورس نہیں۔ یہ تو میں نے تمہارا موڈ درست کرنے کے لیے کہا تھا۔“ وہ ہلکی سی ہنسی۔ ایڈم نے بھنویں بھنچ کے اسے
 دیکھا۔ وہ سنجیدہ ہوئی۔

”پچھلے چھ سال میرے لیے نہیں گزرے، ایڈم۔ میرے لیے صرف ایک لمحہ گزرا تھا۔ دروازہ بند ہوا، میں نے کھولا اور
 دیکھا تو آگے ۲۰۲۳ کا ملا کہ تھا۔ وقت آگے بڑھ گیا تھا اور میں پیچھے رہ گئی تھی۔“

ایڈم کے شانے ڈھلک گئے۔ وہ بس اچھبے سے اسے دیکھے گیا۔

”سوچ رہے ہو کہ اب کس بات پہ خفگی ظاہر کرو؟ جبکہ تمہارے پاس وجہ ہی نہیں پئی۔“

”مجھے کیا معلوم کہ آپ سچ کہہ رہی ہیں یا نہیں۔“ اس نے آواز کو خفا بنانے کی کوشش کی۔ ماتھے کو پھر سے ٹمکن آلود کرنا چاہا۔

”آؤ.... کافی پیتے ہیں۔“ اس نے ہیٹ ترچھا کیا اور اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ اسی خفا شکل کے ساتھ اس کے ساتھ چل دیا۔

پچھلے گھاس پہ ایک واکنگ ٹریک بنا تھا۔ دونوں اس پہ چلتے چلتے آگے آئے۔ درختوں کے نیچے خاموشی سے چند موڑ کاٹے یہاں تک کے سوپ اور کافی کے کارٹ دکھائی دینے لگے۔

وہ دونوں ایک کارٹ کے پاس رکے۔ تالیہ نے ہیٹ اتار کے کارٹ کے ایک ہک سے لٹکایا اور سیلز مین کو دو نوٹ پکڑائے۔ کافی کا آرڈر دینے کے بعد وہ اس کی طرف گھومی۔

”کیسے گزرے تمہارے جیسے سال؟“

”وقت آپ کے لیے واقعی نہیں گزرا؟“ وہ ابھی تک مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ تالیہ نے کندھے اچکائے۔

”میں ایک دفعہ تمہیں بتا چکی ہوں اور تمہیں یقین بھی آچکا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ یادداشت والا ناک؟“

ایڈم نے جیبوں میں ہاتھ ڈالے کندھے جھٹکے اور دور نظر آتی جھیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہ آسان تھا۔“

”جھوٹ بولنا؟“

”ماضی سے بھاگنا۔ چاہے آپ ہمارے ساتھ آئیں، چاہے نہ آئیں، میں نے مراد راجہ کی قید میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ میں یادداشت کھونے کی اداکاری کروں گا۔ مجھے آپ کی کہانی سے ٹکنا تھا۔ اپنی کہانی از سر نو لکھنی تھی۔ اپنے آپ کو اس سب سے نکالنا تھا۔“

”کیا اس طرح تکلیف کم ہو جاتی ہے؟“

”پتہ نہیں۔“ اس نے سیلز مین سے کافی کے کپ پکڑے۔ پھر ایک کپ تالیہ کو تھمایا۔ دونوں ایک دفعہ پھر پتھر ملی روش پہ چلنے لگے۔ سورج اب ڈوب رہا تھا اور جامنی اندھیرا چھارہا تھا۔

”لیکن یوں حالات آسان ہو گئے۔ پولیس نے آپ کی وجہ سے ٹک کرنا چھوڑ دیا۔ وہ لوگ جو میری جان کے دشمن بنے ہوئے تھے انہوں نے بھی میرا چچا چھوڑ دیا۔ میری یادداشت کھونے کی کہانی نے مجھے مزید پاپولر کر دیا۔ مجھے ایک شول گیا جہاں میں اس بارے میں بات کیا کرتا تھا۔ کہ کیسے میں نیند سے جاگا تو میں ایک سیلبرٹی اور دو کتابوں کا مصنف تھا۔ چند

لوگوں نے اس بات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے انہیں فائدہ اٹھانے دیا پھر ان کی دھوکہ دہی کو بیوقوفوں کے ساتھ بے نقاب کر دیا۔ یوں میرا شو مزید ترقی کر گیا۔ پولیس، میڈیا، عوام سب نے میری بات مان لی۔“

”اور فاتح؟“

”انہوں نے مجھ سے تعلق ختم کر لیا اور میں نے ان سے۔ گو کہ مجھے یقین ہے ان کو کبھی یقین نہیں آیا۔ لیکن وہ اس بات کا اعتراف نہیں کریں گے۔“

”اور کیسا لگایہ سارا کون گیم کھیل کے؟“

”کلین سلیٹ کسے بری لگتی ہے؟ خود کو ایسے ظاہر کرنا جیسے نیا دنیا میں آیا ہو۔ یعنی کہ شہرت کی دنیا میں۔ میں نے از سر نو اپنی کہانی لکھی۔ نئے دوست بنائے۔ سب کچھ نئے سرے سے کیا۔ لیکن سکون.... وہ نہیں ملا۔ شاید وہ انسان کے لیے اس دنیا میں لکھا ہی نہیں گیا۔“ وہ کافی پیتے ہوئے قدم اٹھا رہا تھا۔

”مجھے پہلے ہی دن بتا کیوں نہیں دیا؟ وہ اور میں جانتی ہوں جب میں تمہارے گھر آئی تھی تو تم نے کیا کیا تھا۔“

”کیا کیا تھا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تم نے راہداری میں لگے کیمرے سے مجھے دیکھ لیا تھا۔ تم نے اپنی سیکرٹری کو کال کی۔ اسے کہا کہ وہ لفٹ سے اوپر آئے اور ہاتھ میں موجود چیزیں گرا دے۔ پھر تم باہر نکلے گے اور اس سے اونچی آواز میں باتیں کرو گے۔ تم چاہتے تھے کہ میں وہ سب سن کے تمہاری یادداشت دانی کہانی پہ یقین کر لوں۔“

”ظاہر ہے میں جانتا تھا کہ آپ چھپ کے گفتگو ضرور سنیں گی۔ کچھ عادتیں کبھی نہیں بدلتیں۔“ ایڈم نے گہری سانس لی۔ پھر گھونٹ بھرتے ہوئے اس کو دیکھا۔ وہ اب پہلے سے بہتر لگ رہا تھا۔

”کیا ایک لمحے کے لیے بھی آپ کو یقین نہیں آیا تھا میری کہانی پہ؟“

”انہوں۔ جب میں نے سنا تھا تو میں چونکی تھی۔ میرا دل زور سے ڈوبا تھا۔ پھر میں نے تمہارا ایک انٹرویو نکالا اور دیکھا کہ تم کہاں بیٹھے تھے۔ تم اپنی لائبریری میں بیٹھے تھے۔ اور تم نے اپنی لائبریری کے ریکس کو بالکل اسی طرح سیٹ کیا تھا جیسے باپا کے کتب خانے کو تم نے اپنی نگرانی میں سیٹ کروایا تھا۔ وہی سیٹنگ، وہی اونچے نیچے ریک اور ان کے اتنے خانے۔ حالانکہ تمہاری لائبریری ماڈرن طرز پہ بنی تھی۔ بظاہر قدیم ملا کہ سے بالکل مختلف لیکن جیسے ہی میں نے وہ ریک دیکھے مجھے معلوم ہو گیا کہ تم جھٹ بول رہے ہو۔“

”وہ نو۔ مجھے کتابوں نے پکڑا دیا۔“ اس نے افسوس سے سر جھٹکا۔

”لیکن ہو سکتا ہے مجھ وہ کتب خانہ خواب میں نظر آتا ہو۔“

”تب تم لاہوری کو قدیم لگ دیتے۔ تم نے اسے جدید لگ دی تھی۔“ اس نے یاد دلایا۔ ”اور تم نے اداکاری بھی اچھی کی۔ جنگل کے خوابوں کا تذکرہ..... وغیرہ وغیرہ.... لیکن مجھے کبھی یقین ہی نہیں آیا کہ تم سچ بول رہے ہو۔“

”پھر بھی آپ نے ظاہر کیا کہ آپ نے میرا یقین کر لیا ہے۔ وقت کے سوال حل کر لو ایڈم وغیرہ وغیرہ....“ ایڈم نے مسکرا کے سر جھٹکا۔ اس کی شرمندگی کم ہوتی جا رہی تھی۔ ”یا شاید آپ مجھے جانتی تھیں۔“

چند لمحے تک وہ دونوں خاموشی سے داک کرتے رہے۔ پھر ایڈم نے پوچھا۔

”داتن سے ملاقات ہوئی آپ کی؟“

”نہیں۔ وہ کہاں ہے؟“

”معلوم نہیں۔ انہوں نے پہلے سال مجھ سے رابطہ کیا تھا۔ میں نے پہچاننے سے انکار کیا تو دوبارہ رابطہ نہیں کیا۔“ وہ مغمومیت سے بولا۔ پھر چونکا۔ اور رک گیا۔ تالیہ بھی ساتھ ہی رکی۔

”ایک منٹ۔ آپ نے کہا کہ میں میثا کو جانتا ہوں۔ ہم مل چکے ہیں اور مجھے یاد نہیں ہے۔ اب چونکہ آپ جانتی ہیں کہ مجھے سب یاد ہے تو بتائیں۔ میں اس عورت سے کبھی نہیں ملا۔“

تالیہ نے افسوس سے اس کو دیکھ کے نشی میں سر ہلایا۔ ”تم نے واقعی اس کو نہیں پہچانا؟“

”نہیں۔ میں اسے کیسے پہچان سکتا ہوں؟“ وہ واقعتاً الجھ کے بولا۔

”اوہ ایڈم۔“ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ”تم اس سے ملے تھے۔ ساڑھے چھ سال پہلے۔ عصرہ کی گیلری میں۔ وہ ایک

پینٹنگ خریدنے آئی تھی اور تم نے اسے راہداری میں روک کے کچھ کہا تھا۔“

”میں نے اسے کیا کہا تھا؟“

”یہی کہ وہ تنگو کامل کی ملازمہ ہے۔“

ایڈم بن محمد بالکل ساکت ہو گیا۔ ”میں نے وہ آپ سے کہا تھا۔“

”نہیں۔ تم نے وہ ایک آرٹسٹ، سوشلائٹ، امیر عورت سے کہا تھا جو کے ایل میں جانی پہچانی تھی۔ جس کے بال سنہرے

تھے اور وہ ان فاتح کی فیملی سے تعلقات بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔“

ایڈم کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ جھیل کنارے سارے پارک میں موت کا سناٹا چھا گیا۔

”میثا تاج کون آرٹسٹ ہے.....“

”بالکل۔ وہ کاپی کیٹ ہے۔ اس کی شکل دیکھو۔ چھ سال پہلے میں ایسی لگا کرتی تھی۔ اس کے بال اس کے منہ کوٹ... ہیٹ... نگینوں والے زیورات... آرٹ میں دلچسپی... ایک ظالم اسٹاکرایکس ہر بینڈ... اور فاتح کے ایک فیملی ممبر کے ذریعے اس کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش...“

”وہ تالیہ مراد ہے۔ وہ چھ سال پہلے کی تالیہ مراد ہے۔“ وہ دم سادھے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اور حیرت ہے تم نے اسے نہیں پہچانا۔ فاتح نے بھی نہیں۔ اتنے برس جو گزر چکے ہیں۔ تم دونوں نے تالیہ کو بھلا دیا۔ لیکن کوئی ہے جس نے تالیہ مراد کو نہیں بھلایا۔ کوئی ہے ایڈم جو ہم تینوں کو جانتا ہے۔ تم نے دیکھا وہ لڑکی کیا فوٹو گراف کرتی ہے؟ سیاہ گھوڑے۔ قدیم قلعوں کے سامنے کھڑے سیاہ گھوڑے۔ وہ فاتح کا گھوڑا تھا قدیم ملاکہ میں۔ کوئی ہے جس نے عین تالیہ مراد کی پروفائل پہ ایک عورت کو تیار کیا ہے اور وہ ان فاتح کی زندگی میں داخل کیا۔“

”وہ کون دوسرا ہے۔ میثا تاج ایک کون دوسرا ہے۔“ ایڈم نے ماتھے کو چھوا۔ وہ سشدر رہ گیا تھا۔

”بالکل۔ اور وہ کون دوسرا مجھے دیکھ کے پریشان ہو گئی ہے۔ وہ فاتح کے قریب رہ کے جو بھی کرنا چاہ رہی ہے وہ اس میں تیزی لے آئے گی۔ میری موجودگی سے اس کو خطرہ ہے۔“

”آپ جانتی ہیں اسے کس نے بھیجا ہے؟“

”نہیں۔ میں اس عورت کو بھی نہیں جانتی۔ لیکن وہ یا اس کے پیچھے جو بھی ہے اس نے تالیہ مراد کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے اور اسے ہمارے قدیم ملاکہ کے بارے میں بھی علم ہے۔ اس نے تالیہ کے عکس پہ میثا کو بنایا ہے۔ وہ ان فاتح نے اس کو اپنے قریب جگہ اس لیے دی ہے کیونکہ وہ اس میں مجھے دیکھتے ہیں اور وہ خود بھی اس بات سے واقف نہیں ہیں۔ مجھے اور تمہیں ایڈم بن محمد صرف میری بے گناہی نہیں ثابت کرنی بلکہ ہمیں فاتح کو اس عورت سے بھی محفوظ کرنا ہے۔ جو ہمیں کرنا آتا ہے اس سے ہم نے پھر سے اپنی جان بچانی ہے۔“

اس نے کافی کا گھونٹ بھرا اور روش پہ چلنے لگی۔ ایڈم سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ اس کے ساتھ چل دیا۔ وہ جانتا تھا تالیہ کے پاس پلان ہوگا۔ تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا تھا۔

☆☆=====☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)